اسلام میں غریبی کا علاج

تالیف

علامہ یوسف القرضاوی

ترجمہ

نصیر احمد ملی

تخریج

محمد سرور عاصم

مکتبہ اسلامیہ

اسلام میں غربت کا علاج

تالیف

علامہ یوسف القرضاوی

ترجمہ

نصیر احمد ملی

تخریج

محمد سرور عاصم

مکتبہ اسلامیہ

کتاب ---------------- اسلام

تالیف ---------------- علامہ یوسف القرضاوی

ناشر ---------------- محمد سرور عاصم

اشاعت ---------------- مئی 2011ء

قیمت ----------------

ملنے کا پتا

مکتبہ اسلامیہ

بالمقابل رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور۔ پاکستان فون:042-37244973

بیسمنٹ سمٹ بینک بالمقابل شیل پٹرول پمپ کوتوالی روڈ، فیصل آباد-پاکستان فون:041-2631204, 2034256

E-mail:maktabaislamiapk@gmail.com

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سخن اوّل

اسلام کی ایمانی، اخلاقی اور روحانی تہذیب کا مادّی تحریکوں کے ساتھ ایک مستقل ٹکراؤ اور تصادم رہا ہے۔ گزشتہ تین صدیوں میں صنعتی انقلاب کے مادّی نتائج کے گوشوارے نے انسانوں کو حیوانی سطح کی قعرِ مذلت میں گرا رکھا ہے۔ صنعتی انقلاب سے بیک وقت دو نوعیت کے ردِ عمل پیدا ہوئے۔ ایک آزادانہ سرمایہ دارانہ معیشت کا پہلو ہے، تو دوسرا تمام ملکی اور قومی وسائل کو ایک مخصوص اور محدود مرکزی قوت کے ہاتھوں میں سونپ دینے کا تصور ہے، جسے معاشی اصطلاح میں اشتراکیت یا کمیونزم کا نظریہ قرار دیا جاتا ہے۔ یہ دونوں معاشی تصورات انتہا پسندانہ اور افراط و تفریط کا شکار ہیں۔ ان کے خونیں پنجے میں انسانیت ابھی تک سسک رہی ہے۔ ان سیکولر قوتوں نے چھوٹے اور غریب ملکوں کا استحصال کر کے انہیں ایک مستقل غریب اور پسماندگی کا شکار کر دیا ہے۔ ان دونوں معاشی نظاموں کی افراط و تفریط کے مقابلے میں اسلام کا عادلانہ معاشی نظام عدل اجتماعی کے تمام تقاضوں کو پورا کرنے کا ایک مستند تاریخی ریکارڈ رکھتا ہے۔ تمام معاشی نظاموں کا حقیقی ہدف انسانیت کو غربت سے نجات دلا کر ایک خوشحال زندگی کے وسائل و ذرائع فراہم کرنا ہے مگر مادی سطح کے معاشی نظاموں میں کوئی بھی آج تک اس ہدف کے حتمی اور یقینی نتائج و ثمرات حاصل نہیں کر سکا۔ مغرب کے ان نظاموں میں فلاحی مملکت یا معاشرے کا تصور بھی حقیقی فلاح سے بہت بعید اور مواخات کی روح سے خالی دکھائی دیتا ہے۔

اسلام کے معاشی نظام میں استحصال کی ہر شکل کو ممنوع اور مکروہ قرار دیا گیا ہے۔ سودی معیشت ایک محدود سرمایہ دارانہ اقلیت کو جس معاشی قوت سے بدل دیتی ہے اور وہ اس مادّی قوت کے حصول کے بعد مزدوروں اور غریب طبقات سے کیا سلوک روا رکھتا ہے، اس سے آجر و اجیر کے ظلم اور مظلومیت کی مغربی تصویر سب کے سامنے موجود ہے۔ اسلام سود اور اس کی اساس پر پیدا ہونے والے فساد کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتا ہے۔ اسلام کے

معاشی نظام میں شراکت ومضاربت تجارتی زندگی کے توازن کو عادلانہ سطح پر برقرار رکھتا ہے اور اپنے زکوٰۃ وصدقات کے مستقل اور دائمی نظام کے باعث عملاً معاشرے سے غربت اور محرومی کے تصورات کو ختم کرتا ہے۔ اس وقیع موضوع پر بیسیوں مصنفین کی گراں قدر تصنیفات موجود ہیں مگر ان میں اسلام کے ایک نامور فرزند ڈاکٹر یوسف القرضاوی کی تحریروں کو ایک خاص مقام، معیار اور استناد حاصل ہے۔ علامہ موصوف نے گزشتہ نصف صدی میں اپنی درجنوں تصانیف کے ذریعے جو اہم علمی اور تحقیقی میراث پیدا کی ہے، ان میں موصوف کا پی ایچ ڈی کا مقالہ جو ''فقہ الزکاۃ'' کے عنوان سے عربی کے علاوہ کچھ دوسری زبانوں میں بھی موجود ہے۔ یہ مقالہ اسلام کی معاشی حکمت عملی کے ایک بہت بڑے اور دائمی اثرات کے حامل پہلو کی تمام تر اور جدید تر صورتوں کو ان کے عملی امکانات کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

ڈاکٹر موصوف کا فکری انسلاک مصر کی اس اسلامی تحریک کے ساتھ ہے۔ جسے ہم حسن البنا شہید کی اخوان المسلمون کے نام سے جانتے ہیں۔ مصری سرزمین اور مملکت کا یہ تضاد عجیب رہا ہے کہ اس کی علمی وتحقیقی اور دعوتی فضا میں تو سیکڑوں علما وفقہا دکھائی دیتے ہیں مگر سیاسی میدان میں فراعنۂ مصر کا سا دل و دماغ رکھنے والے حکمران نظر آتے ہیں، جن کے پے درپے مظالم کے باعث بہت سی سعید روحیں تو درجۂ شہادت پر فائز ہوئیں، ہزاروں سنت یوسفی کی پیروی میں اسیر زندان رہے اور بہت سے جلا وطنی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس علمی اور تحریکی ہجرت کے ایک مسافر کا نام ڈاکٹر یوسف القرضاوی ہے، جس کے علمی اور تحقیقی کارناموں کو آج ایک زمانہ خراج پیش کر رہا ہے۔ پون صدی کے قریب زندگی گزارنے والی یہ علمی شخصیت گزشتہ چار عشروں سے دوحہ (قطر) میں مقیم ہے اور عالم اسلام کے مختلف علمی اور تحقیقی اداروں کے ساتھ وابستہ ہے۔

''اسلام میں غریبی کا علاج'' نامی اس کتاب کو بھی انہوں نے تقریباً چالیس سال پہلے تحریر کرنا شروع کیا۔ اس کے متعدد عربی ایڈیشن شائع ہوئے، مگر اردو زبان میں اس کا ایک مفید ترجمہ اردو خواں دنیا کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر یوسف القرضاوی کی پیش نظر کتاب میں غربت کے انسداد کے لیے اسلام کی حکمت عملی اور تدابیر کو پیش کرنے سے پیشتر مصنف مذکور نے اس موضوع پر مختلف مذاہب اور تہذیبوں کے نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے۔ یہود جو دنیا کی سب سے بڑی حریص اور مادہ پرست قوم ہے، وہ تو تحریف شدہ تورات میں اس تصور کو اپنے نام نہاد مذہبی لبادے میں یوں پیش کرتی ہے:

''غریبی ازل سے ہے، ابد تک رہے گی اور غریب دنیا سے کبھی ختم نہ ہوں گے۔'' (تثنیہ: ۱۵، ۱۰، ۱۱)

سرمایہ دارانہ تہذیب میں استحصال اور ظلم کی مثالیں واضح ہیں۔ اس کے ردّ عمل میں اشتراکیت وجود میں آئی جو سرمایہ دارانہ طبقات کو ختم کر کے غربت کے مرض کے علاج کی مؤید تھی مگر وہ اپنے باطل دعاوی اور غلط مزعومات تلے دب کر رواں صدی کے دوران ہی اپنے منطقی انجام تک پہنچ گئی۔ مسیحیت کا یہ موقف رہا ہے کہ ترک دنیا انسانوں کے دکھوں کا علاج ہے۔ فلاسفہ میں جبریہ کا یہ عقیدہ رہا ہے کہ غربت کو ایک آسمانی فیصلہ سمجھ کر قبول کر لینا چاہیے۔ فلاحی ریاستیں غربت کو ختم کرنے کی بجائے اسے برقرار رکھنے کے لیے پروگرام بناتی ہیں اور بیروزگاروں کی ایک فوج ظفر موج کو مملکت کے معاشی ڈھانچے میں سمونے کی بجائے انہیں علیٰ حالہ قائم رکھنا چاہتی ہیں۔ بہت سے کم نظر اور کم سواد لوگ اس فلاح کے تصور کے لیے رطب اللسان دکھائی دیتے ہیں۔ غربت کے اس پہلو پر اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا نظام یہ سوچنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ اس سے سوسائٹی اور سماج پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ نیز یہ غربت انسانی اخلاقیات اور نفسیات پر کیسے قبیح اور گھناؤنے اثرات مرتب کرتی ہے۔ جو لوگ اسے محض تقدیر اور قسمت کے بہانے سے دیکھتے ہیں، ان کا نقطۂ نظر بھی معاشرے میں ایک منفی اثر پیدا کرتا ہے۔ جس کا کم از کم اسلام اور اس کے عادلانہ اجتماعی نظام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ڈاکٹر قرضاوی نے اپنی اس وقیع علمی کتاب کو نو مستقل ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ ابواب کی اس علمی ترتیب سے ہی ان کے ذوق علمی اور نتائج تحقیق کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا

ہے۔ اپنی تصنیف کے پہلے باب میں وہ مختلف مذاہب میں غریبی کے تصور کا تحقیقی جائزہ لیتے ہیں۔ دوسرے باب میں مذاہب کے غلط موقف کے مقابلے میں اسلامی تصور کی وضاحت کرتے ہیں اور اس ضمن میں قناعت اور خیرات کے دینی تصور کی تفصیل کو پیش کرتے ہیں۔ اسلام غربت کو تقدیر کا اٹل فیصلہ تصور نہیں کرتا اور نہ ہی محض خیرات کے ذریعے اس کے حل کو بطور آخری تجویز قرار دیتا ہے بلکہ ایک مستقل اور مثبت نظام کو تجویز کرتا ہے۔ جس کی تفصیلات مابعد کے ابواب میں دکھائی دیتی ہیں۔ چوتھے باب میں مصنف نے ان اسلامی تدابیر سے بحث کی ہے، جن پر عمل کرنے سے غربت کا کسی معاشرے سے خاتمہ ممکن ہے اور ہر انسان آبرومندی سے اپنی ضروریات زندگی کو حاصل کرسکتا ہے۔ اسلام حرکت وعمل پر توجہ دلاتا ہے اور توکل کے غلط مفہوم کی نفی کرتے ہوئے قناعت اور سادگی کے تصور کو پیش کرتا ہے۔ وہ افراد معاشرہ کو چھوٹے چھوٹے کاموں میں مصروف دیکھنا چاہتا ہے اور گداگری اور بھیک مانگنے والے طبقے کو معاشی عمل میں جڑا ہوا دیکھنا چاہتا ہے۔ روزگار کی فراہمی کے مقامی وسائل کے مطابق انہیں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی تعلیم دیتا ہے اور زکوٰۃ و صدقات کو بھی اسی مقصد کا ایک ذریعہ قرار دیتا ہے۔ پانچویں باب میں زکوٰۃ کی نوعیت کو واضح کرتے ہوئے اسے ایک ہمہ گیر سماجی کفالت کے نظام کے بطور پیش کیا گیا ہے۔ وہ تندرست افراد کو زکوٰۃ وصول کرنے کی بجائے انہیں اس لائق بنانے کی تعلیم دیتا ہے کہ وہ خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر دوسروں کی مدد کا جذبہ اپنے اندر پیدا کریں۔ اس ضمن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر زکوٰۃ کی تقسیم کا حقداروں میں تقسیم کا اصول کیا ہونا چاہیے۔ کیا غریبوں کی اس قدر مدد کی جائے کہ پھر زندگی بھر انہیں سوال کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے یا سال بھر کے دورانیے کے لیے انہیں مطمئن کر دیا جائے۔ اس کا صحیح جواب دونوں تراکیب کے مناسب اور موزوں تجزیے اور فیصلے میں مضمر ہے۔

اپنی کتاب کے چھٹے باب میں فاضل مصنف نے غریبی کے انسداد کے لیے اسلام کے ایک اہم ادارے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اسلامی ریاست میں بیت المال کی تشکیل میں جو عناصر کارفرما ہیں، ان میں ایک زکوٰۃ وصدقات بھی ہے۔ لہٰذا ان اموال کو بیت المال سے غربت

کے انسداد کے لیے مشاورت کے ساتھ استعمال کیا جانا چاہیے۔ اسلام میں احتساب اور جواب دہی کا تصور ہر سطح پر موجود ہے۔ لہٰذا بیت المال کی رقوم کا استعمال بھی اسی احتسابی روح کے ساتھ ہونا چاہیے۔ ساتویں باب میں مصنف نے بیت المال سے ماورا اسلام کی ان تعلیمات کا تذکرہ کیا ہے جن کے حوالے سے غربت کے خاتمے میں یا ان کو کم کرنے میں مدد ملتی ہے۔ ان میں پڑوسیوں کے حقوق، قربانی کا گوشت اور چمڑے، قسم، ظہار اور روزے کی حالت میں عدم احتیاط کے کفارے کی ادائیگی، ہدی کے جانور اور انفاق فی سبیل اللہ کی دوسری صورتیں شامل ہیں۔ مسلم ریاستوں میں اوقاف کا ایک مستقل ضابطہ اور دستور موجود ہے۔ اوقاف کے اس نظام سے اجتماعی خیر کے بہت سے امور طے ہوتے ہیں۔ شفا خانے، مدارس، سرائے، یتیم خانے اور کئی دوسرے رفاہی ادارے ان کے زیر انتظام چلتے ہیں، جن سے بالآخر غربت کو کم کرنے میں نمایاں مدد ملتی ہے۔ فاضل مصنف نے اوقاف کے اس آٹھویں باب میں ایک قدیم وقف سے ہسپتال کے لیے جن ضوابط کو تحریر کیا ہے، اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست میں متنوع، فلاحی ادارے کس نوعیت کا تعمیری کردار انجام دیتے ہیں۔ اپنی تصنیف کے آخری باب میں اسلامی ریاست اور معاشرے کے اس ماحول کو پیش کیا گیا ہے، جو باہمی اخوت اور ہمدردی سے تشکیل پاتا ہے۔ ریاستی ذمہ داران کا بنیادی فریضہ مخلوق خدا کی خدمت گزاری ہے۔ اسلامی نظام کا بڑا کارنامہ ہے کہ وہ پیداواری صلاحیتوں کو بڑھاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں غربت خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔ صحت مند ہونے کے باوجود نکما اور بیکار رہنا ایک مسلمان کے شایان شان نہیں ہے۔ ہاتھ سے رزق کمانے اور محنت کو اسلام میں ایک قدر خیر گردانا گیا ہے۔ البتہ اسلامی تعلیمات کا ایک خاصہ عجیب تر ہے کہ وہ غریبوں اور مفلوک الحال طبقے کی مدد اس طریق پر کرنا چاہتا ہے کہ اس سے عزت نفس کا احساس مجروح نہ ہو۔ گزشتہ تمام صدیوں کی اسلامی تاریخ اس امر کی شہادت فراہم کرتی ہے کہ اسلامی ریاستوں نے اجتماعی کفالت کے ایسے ذرائع کو اختیار کیا ہے جس کے نتیجہ میں غربت کا خاتمہ ممکن ہی نہیں یقینی بھی ہے۔

''اسلام میں غریبی کا علاج'' عربی سے اردو زبان میں منتقل ہوئی ہے۔ اس سے

قبل بھی ڈاکٹر یوسف القرضاوی کی بہت سی کتابوں کا اردو ترجمہ ہو چکا ہے۔ تراجم کی اس روایت میں یہ ترجمہ بھی ایک حسین اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ ہر شخص کے لیے مفید ہے، جو اسلام کی معاشی حکمت عملی کے حوالے سے غربت کے انسداد کا آرزو مند ہے۔ یہ کتاب ایسی روشنی اور رہنمائی فراہم کرتی ہے جس سے اسلامی ریاستیں اور اس کے حکمران نیز خوشحال مسلمان گھرانے اس دنیا میں حقیقی فلاح کا نمونہ قائم کر سکتے ہیں۔ اسلامی تہذیب اپنی درخشانی اور امتیازی اوصاف کو اسی وقت انسانیت پر واضح کر سکتی ہے جب ایک ماڈل اسلامی فلاحی ریاست ان تمام تر اقدامات کے ساتھ وجود میں آئے، جن کا اظہار اس فاضلانہ کتاب میں ہوا ہے۔ اپنے محکم استدلال، علمی مراجع، تازہ اسلوب اور اجتہادی بصیرت کے لحاظ سے اس کتاب کا اردو خواں طبقے میں ان شاء اللّٰہ خاطر خواہ استقبال کیا جائے گا۔

مکتبہ اسلامیہ کے مہتمم اور منتظم محمد سرور عاصم ہم سب کے شکریے کے مستحق ہیں کہ ان کی علمی جہد سے ایک بصیرت افروز کتاب قارئین کے پیش خدمت ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس کاوش کو قبول فرمائے اور عامۃ المسلمین کے لیے نافع بنائے۔ آمین یا رب العالمین۔

العبد المذنب

پروفیسر عبدالجبار شاکر رحمۃ اللہ علیہ

بیت الحکمت، لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

یہ چھوٹی سی کتاب جو آپ کے ہاتھوں میں ہے، اسلامی معاشیات کی کوئی کتاب نہیں، اس لیے کہ یہ مستقل ایک موضوع ہے جس کے لیے علیحدہ تصنیف درکار ہے جس میں انسانی سرگرمی کے لیے دولت کی پیداوار اور اس کی صحیح تقسیم وخرچ سے متعلق اسلامی نظریے اور اصول پیش کئے جاتے ہیں، جن سے اسلام نے دنیا کے تمام سیاسی ومعاشی فلسفوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ منصفانہ اور حکیمانہ طور پر انسانی آزادی، عام خوشحالی اور امن و مساوات کی ضمانت دی اور دین ودنیا کے درمیان حقیقی توازن برقرار رکھا۔

اسلام کا یہ اقتصادی نظام کس قدر وسعت کا حامل ہے؟ اس کا کچھ اندازہ راقم کو اس وقت ہوا، جب وہ گزشتہ کئی برسوں سے ''فقہ الزکوۃ'' کے موضوع پر تحقیقی کام میں مصروف تھا۔ خدا کا شکر ہے اسی نام سے یہ مقالہ مکمل (ہوکر اشاعت پذیر) ہوا، لیکن اسلام کے معاشی نظام پر تفصیل سے کچھ لکھنے کا اب تک موقع نہ ملا، دعا ہے کہ باری تعالیٰ غیب سے اس کے لیے مواقع فراہم کرے۔ وَمَا تَوفِيقِي اِلاَّ بِاللّٰهِ۔

ہاں! اس مختصر سی کتاب میں اسلامی اقتصادیات کے اس مخصوص حصے سے بحث کی گئی ہے جس کا تعلق غریبی اور اسکے علاج سے ہے، جس میں غریبی کے حقوق اور خاص طور پر ان وسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے جن کے سہارے سماج کا یہ پسماندہ طبقہ چین کا سانس لے سکے اور اسلامی دستور کے زیر سایہ اپنی خودی اور عزتِ نفس کی حفاظت کر سکے، انسان آج سے نہیں تاریخ کے نامعلوم زمانے سے غربت اور غریبی سے واقف ہے۔ اس مسئلے کو حل کرنے اور غریبی کی مشکلات کو دور کرنے کے لیے قدیم زمانے سے مختلف فلسفوں اور مذاہب نے اپنی سی کوششیں کی ہیں، کبھی انہوں نے وعظ ونصیحت کا راستہ اپنا کر خوشیوں سے بھرپور زندگی کا لالچ دیا، اور کبھی افلاس اور اس کے انجام سے ڈرایا، دھمکایا، کبھی عالم مثال

میں ایسے خاکے بنائے جن میں فقر و ناداری یا کسی قسم کی طبقاتی کش مکش نہ تھی، لیکن ظاہر ہے یہ نقوش کتابوں کے صفحات پر باقی رہے، مگر دھرتی کے حقیقی انسانوں میں کہیں ان کا وجود نہ رہا'' جمہوریہ افلاطون'' (Republic) کے نام سے مشہور نظریہ اس کی واضح مثال ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے چند صدی قبل پیش کیا گیا تھا۔ایک اور مکمل اباحیت پسند تحریک ایران میں چلائی گئی، لیکن پچھلی تحریکوں سے کہیں زیادہ بے شرمی اور انتہا پسندی کا شکار خود ہوئی، یہ تحریک مُزدک (پیدائش ۴۸۷ء) کی پانچویں صدی عیسوی کی تحریک تھی، جس نے دولت اور عورت کو مشترکہ ملکیت قرار دیا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ موجودہ دور میں غربی اور معاش کا مسئلہ ہمہ گیر شکل میں ہر کس و ناکس کے عقل و شعور پر چھایا ہوا ہے۔یہی وجہ ہے کہ شورش پسند اور سازشی عناصر نے عوام میں انتشار پھیلا کر اپنی لیڈری چمکانے اور اس کی آڑ میں جھوٹی لادینیت پھیلانے کے لیے اس مسئلے کو آڑ بنا لیا ہے، جب کہ اوپر سے فریب کا پردہ ڈال کر وہ یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ اس کا طریق کار کمزوروں کی ہمنوائی اور غریبوں کی حمایت ہے۔انہیں شہ اس لیے بھی ملی کہ مسلمان بھی اسلامی تعلیمات سے غافل رہنے کی بنا پر ان کے جھوٹے پروپیگنڈے کا شکار ہوئے، اس غلط پروپیگنڈے نے اسلامی نظام کو مسخ کرنے اور اس کے محاسن کو زائل کرنے کے لیے کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔اس پر مستزاد یہ کہ مسلمانوں کی مایوس طرز زندگی اور پستی و محکومی کے دور سے تعلق رکھنے والی بعض مسلم نام نہاد رہنماؤں کی غلط تعبیروں نے اس بگاڑ کو مزید سہارا دیا۔

ایسے حالات میں کسی درجہ اسلامی ہدایات و تعلیمات سے باخبر ہر فرد کے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ عام مسلمانوں کو بعثت محمدی (ﷺ) کی اس حقیقت سے روشناس کرائے کہ آپ سارے عالم کے لیے ہادی اور رحمت بنا کر بھیجے گئے تھے۔اللہ نے آپ ﷺ کو ایسا دستور عطا فرمایا تھا جو فرد و جماعت کی جملہ مشکلات کو حل کر دیتا ہے، ماؤف کرنے والی دواؤں کی طرح محض سطحی علاج نہیں کرتا، جس میں تھوڑی دیر کے لیے درد چلا جاتا ہے، لیکن اصل روگ نہیں جاتا۔

غربت وافلاس کے جس علاج کی طرف اس کتاب میں نشاندہی کی گئی ہے اسے کتاب وسنت اور فقہائے مجتہدین کے مسلمہ اصولوں سے گہرا تقابل کر لینے کے بعد درج کتاب کیا گیا ہے۔ اس لیے بحمداللہ اس ملامت کا قطعی اندیشہ نہیں کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور ائمہ عظام (رحمہم اللہ اجمعین) کی سمجھ سے ہٹ کر یہ کوئی نیا اسلام ہے جسے پیش کیا جا رہا ہے۔ ہمیں یہ کہنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ بعض نام نہاد مستشرقین نے اسلامی دعوت وتبلیغ پر لکھی گئی حالیہ چند کتابوں پر اس قسم کے الزامات عائد کیے ہیں!

کتاب کے مطالعے سے ناظرین کو خود اندازہ ہوگا کہ اسلام شروع سے غربت اور اس کے علاج، غریبوں کے حقوق کی حمایت اور ان کی مادی اور بنیادی ضرورتوں میں تعاون کا قائل رہا ہے اور یہ ایسا امتیاز ہے، جس سے ان مذاہب اور ازموں کا دامن سدا خالی رہا ہے جن کا پروپیگنڈہ خود ہمارے ملکوں میں اور دنیا کے دوسرے ملکوں میں بڑے زور وشور سے جاری ہے۔

اسی طرح ناظرین یہ بھی جان لیں گے کہ اسلام کو کسی دوسرے ازم کا نام دینا، یا کسی دوسرے ازم کو اسلام کا نام دینا بھی ایک زبردست مغالطہ ہے، چنانچہ یہ نعرہ بڑا پرفریب ہے کہ اشتراکیت (سوشلزم) اور اسلام میں کوئی فرق نہیں یا اسلام سرمایہ دارانہ نظام کو چاہتا ہے! یہ اس لیے کہ دائیں اور بائیں بازو کے دوسرے سبھی نظریوں اور افکار کے مقابلے میں اسلام کی نگاہیں، دنیائے انسانی کی مادی، روحانی، مذہبی، اخلاقی، سیاسی، معاشرتی اور معاشی غرض جملہ ضروریات پر سب سے زیادہ گہری اور متوازن ہیں، اس کا تعلق مشرق سے ہے نہ کہ مغرب سے، بلکہ اس کا تمام تر تعلق انسان دوستی اور ربانیت الٰہی سے ہے۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تیل خود بخود روشن ہو جائے گا اگرچہ اس کو آگ نہ چھوئے، نور پر نور ہے، اللہ جس کو چاہتا ہے اپنے نور سے ہدایت دیتا ہے۔" (۲۴/النور:۳۵)

ہمیں پوری تندہی اور جرأت سے اسلام کے انہیں اساسی اور امتیازی اوصاف کی طرف لوگوں کو دعوت دینی چاہیے۔ ہماری نظروں میں دوسرے تصورات اور افکار کے

مقابلے میں، اسلام کی حفاظت عزیز ہونی چاہیے۔ اس لیے کہ تنہا یہی ہماری مشکلات کا حل، اور تیرگی کے مقابلے میں، روشنی کی کرن ہے، ورنہ اس کے سوا فریبی اور فریب خوردہ ذہنیت کے پھیلائے ہوئے دوسرے تمام نظریے اور منصوبے پریشان خیالات، خام تجربوں اور جھوٹے خواب سے کسی طرح کم نہیں ہیں، یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کے پس پردہ کسی درجہ میں بھی بدطینت یہود، بدنہاد کمیونسٹ اور بدباطن منکرین اسلام کی ریشہ دوانی اپنا کام کر رہی ہے، جن کے متعلق قرآن پاک کا فیصلہ ہے:

"اور جو لوگ منکر ہیں ان کے کام ایسے ہیں، جیسے صحرا میں ریت، پیاسا اسے پانی سمجھ کر قریب جاتا ہے، لیکن وہاں کچھ ہاتھ نہیں آتا، ہاں اللہ کو اپنے قریب پاتا ہے، جو وہیں ان کا حساب بے باق کر دیتا ہے، اس لیے کہ وہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔ یا ان کے کام ایسے ہیں، جیسے گہرے اندھیرے دریا میں لہر چڑھتی چلی آئے، پھر اس کے اوپر دوسری لہر، اس کے اوپر کالی گھٹائیں، بس ایک کے اوپر ایک، ایسی تیرگی کا عالم ہو کہ ہاتھ سجھائی نہ دے، بھلا جسے اللہ روشنی نہ دے اسے کہاں سے روشنی مل سکتی ہے۔" [۲۴/النور:۳۹،۴۰]

یوسف القرضاوی

دوحہ، قطر

شعبان ۱۳۸۶ھ مطابق نومبر ۱۹۶۶ء

☆...... مسیحی موقف

☆...... جبریہ کا موقف

☆...... خیرات سے غربت کا علاج

☆...... سرمایہ داروں کا موقف

☆...... یہ فسطائی ذہنیت!

☆...... مارکسسٹ کمیونسٹوں کے نزدیک

باب اوّل

غریبی مختلف مذاہب کی نظر میں

غریبی کے بارے میں قدیم زمانے کے لوگوں کا رجحان مختلف رہا ہے، آیندہ سطروں میں ہم ایسے چند موقف کی وضاحت کررہے ہیں:

مسیحی موقف

ترک دنیا اور رہبانیت کے مسیحی...... دعوے داروں کا نظریہ، یہ ہے کہ غریبی سے پناہ مانگنے یا اس کا علاج تلاش کرنے کی چنداں حاجت نہیں، اس لیے کہ یہ خدا کی نعمت ہے، جسے وہ اپنے مخصوص بندوں کو عطا کرتا ہے، تاکہ ان کا مطمح نظر دنیا نہیں، آخرت ہو، ان کا تعلق صرف باری تعالیٰ سے ہو اور انکا رویہ عام انسانوں کے ساتھ ملنساری اور محبت کا ہو، ان سرمایہ داروں کا سا نہ ہو جو دولت کمانے کے نشے میں چور ہو کر ہر طرح کے فسق و فجور میں غرق اور کبر و نخوت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

کچھ مسیحی ایسے بھی ہیں، جو سمجھتے ہیں کہ دنیا ایک خرابات اور فتنہ و شر کی آماجگاہ ہے اور خیر کا راستہ بس یہی ہے کہ جس قدر جلد ہو سکے دنیا خود فنا ہو جائے، یا کم از کم انسان کا دائرہ حیات ہی محدود ہو جائے، کیونکہ اس کے بغیر نجات ممکن نہیں، چنانچہ ان کے نزدیک دوراندیشی یہی ہے کہ انسان اپنی زندگی کی ضرورتوں کو جس حد تک کم کرسکتا ہو کرتا جائے اور صرف اتنے پر گزارہ کرے جتنے سے جسم و جان کا رشتہ باقی رہے۔

ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ مقدس مسیحیوں نے، بت پرستوں اور مختلف مظاہر کی پرستش کرنے والوں سے اس نظریہ کو مستعار لیا ہے، اس لیے کہ ان مذاہب کے نزدیک غریبی اس لیے مقدس ہے کہ غربت اور افلاس میں انسانی بدن مشقت اور سختی کا خوگر ہو جاتا ہے اور یہ امر مسلم ہے کہ جسمانی مشقت ہی روح کی بالیدگی اور ارتقا کا پہلا زینہ ہے، لیکن سب سے زیادہ دکھ اس بات کا ہے کہ بھارتی سنتوں، ایران کے مینوں اور مسیحی

راہبوں سے متاثر ہو کر بعض مسلمان صوفیا میں بھی یہی رجحان سرایت کر گیا، جبکہ اسلامی تہذیب و تمدن کو بگاڑنے اور اس کے پاکیزہ چشمے کو گدلا کرنے میں ان ہی نظریوں کا ہاتھ رہا ہے، مسیحیوں کی کسی نام نہاد آسمانی کتاب کا ایک جملہ مجھے یاد ہے کہ جب تم غربت میں مبتلا ہو تو کہو "بہت خوب، نیک لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں اور جو دولت ملے تو کہو! کسی گناہ کی سزا ہے جو فوراً مل رہی ہے۔"

آپ خود غور کیجیے، ایسے لوگوں سے غریبی کے کسی خاطر خواہ علاج کا مطالبہ کہاں تک درست ہوگا جو غریبی کو سرے سے کوئی بیماری تسلیم نہیں کرتے۔

جبریہ کا موقف

جبریہ کا موقف مسیحیوں سے قدرے مختلف ہے، جہاں تک افلاس و ناداری کا تعلق فتنہ و مصیبت سے ہے، اس پر انہیں بھی اتفاق ہے، لیکن ان کا عقیدہ ہے کہ یہ ایک آسمانی فیصلہ ہے جس کے سامنے نہ دوا کارگر ہے نہ کوئی علاج سودمند، اس لیے کہ غریبوں کی غریبی اور سرمایہ داروں کی فارغ البالی دونوں کا تعلق اللہ کی مشیت اور تقدیر کے فیصلوں پر مبنی ہے، خدا چاہتا تو سبھی کو قارون کا خزانہ دے کر امیر و کبیر بنا دیتا، لیکن اس کی مشیت ہوئی کہ کسی کو کسی پر فوقیت رہے، کوئی پست رہے کوئی بلند رہے، اس لیے اپنی مرضی کے مطابق جسے چاہا آسودہ کر دیا، جسے چاہا رزق کی تنگی میں مبتلا کر دیا اور یہ اسی لیے کہ ہر حال میں ان کی آزمائش کرے۔ اس کی بنائی ہوئی تقدیر میں کوئی ردو بدل نہیں کر سکا اور نہ ہی اس کے فیصلوں پر حرف گیری کا کسی کو حق پہنچتا ہے۔ یہ اور اس جیسے دوسرے خیالات، جو اگرچہ حق و درست ہیں، لیکن جبریہ نے ان کا استعمال باطل کے لیے کیا ہے۔

اس فریق کی نظر میں غربت و افلاس کا مجوزہ علاج بس صبر و تلقین کے یہ فقرے ہیں، جن میں غریبوں سے کہا جاتا ہے کہ وہ تقدیر پر شاکر رہیں، آزمائش پر صبر کریں اور جس قدر ملے، اسی پر اکتفا کریں، کیونکہ قناعت لافانی دولت اور کبھی نہ ختم ہونے والا سرمایہ ہے اور بقول ان کے قناعت کا مفہوم یہ ہے کہ بھلی بری جس طرح کٹ رہی ہو، آدمی اس پر خوش رہے۔

مگر حیرت ہے کہ جبریہ کا یہ فرقہ سرمایہ داروں اور ان کے بے جا اسراف و فضول

خرچی پر کوئی اعتراض نہیں کرتا، نہ ہی انہیں کسی قسم کی تلقین کرتا ہے، ان کا روئے سخن بس غریب ہیں اور ان کی نصیحت کا لب لباب بھی اسی قدر ہے کہ ''تن بتقدیر رہو۔ قسمت سے زیادہ کی جستجو نہ کرو، بھلا نوشتۂ تقدیر بھی کوئی بدل سکتا ہے؟''

خیرات سے غریبی کا علاج

اس نظریے کے قائل مسئلے کے ایک پہلو میں جبریہ کے حامی ہیں، یعنی اس فرقے کے افراد غریبی کو مصیبت ضرور خیال کرتے ہیں، لیکن ان کی نظر میں اس کا علاج ناممکن نہیں، پھر یہ علاج بھی غریبوں کو محض صبر و رضا کی تلقین کر دینے پر موقوف نہیں۔

جیسا کہ دوسرا فرقہ اس کا قائل ہے، بلکہ یہ ایک قدم آگے بڑھا کر سرمایہ داروں کو بھی ان کی امداد اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کرتے ہیں، ان سے کہتے ہیں کہ اللہ کے نزدیک اس کا بڑا اجر ہے، اور ان کے ساتھ بدسلوکی کرنا سخت ناانصافی ہے اور ایسے لوگ برے انجام اور جہنم کی سزا کے مستحق ہیں۔

لیکن دشواری یہ ہے کہ اپنی تجویز میں غریبوں کو دی جانے والی امداد کی کوئی حد مقرر نہیں کرتے۔ نہ ہی نہ دینے والوں کے لیے سزا تجویز کرتے ہیں۔ اسی طرح ان کے یہاں ایسا کوئی نظم بھی نہیں جس کے ذریعہ امداد کی مطلوبہ رقم مستحقین کو مل جایا کرے۔ ان کا اعتماد صرف لوگوں کے جذبۂ فیاضی اور جزا و سزا کے نجی عقیدے پر ہے اور بس!

آج سے بہت پہلے، ماضی میں ایسا وقت ضرور آیا جب کہ سمجھدار طبقہ، جبریہ اور مسیحیوں کے عقیدوں سے متاثر تھا، لیکن بعد میں یہ سحر ٹوٹ گیا اور لوگ اس خیال کے ہو گئے کہ انفرادی خیرات سے غریبی کا انسداد ممکن ہے۔ سخت حیرت ہے کہ عہد وسطیٰ (Middle Ages) کا یورپ بھی اس نظریے سے بری طرح متاثر تھا، جب کہ ان کے اندر شروع دنیا سے متعدد خامیاں موجود تھیں۔

سرمایہ داروں کا موقف

چوتھا موقف سرمایہ داروں کا ہے۔ یہ طبقہ غریبی کو زندگی کا پیچیدہ اور سنگین مسئلہ

تسلیم کرتا ہے، لیکن ان کی نظر میں اس کی تمام تر ذمہ داری غریبوں اور ان کی بھلی بری تقدیر پر عائد ہوتی ہے، وہ یہ تسلیم نہیں کرتے کہ اس کی ذمہ داری مالداروں، حکومت یا کسی اور کے سر ڈالی جائے، یہ اس لیے کہ دولت اور صلاحیت کے استعمال کا اختیار ہر کسی کو حاصل ہے، پھر یہ کیوں کر درست ہوگا کہ کرنی کسی کی ہو اور باز پرس دوسرے سے کی جائے؟

قارون اس موقف کا سب سے بڑا نمائندہ تھا، یہ اسرائیلی تھا، لیکن اپنی قوم کا باغی اور حکومتِ وقت کا وفادار تھا، خدا نے اسے اتنے خزانے عطا کئے تھے جن کی کنجیاں طاقتور مردوں کی ایک جماعت مشکل سے اٹھا پاتی تھی، تاہم قوم کی زبوں حالی کا اسے کوئی احساس نہ تھا، جب اس کی قوم نے اسے سمجھایا کہ

﴿ وَابْتَغِ فِيمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ۝﴾ (۲۸/ القصص:۷۷)

"(اس خداداد دولت سے) آخرت کمانے کی فکر کر، غور کر، دنیا میں خود تیرا کتنا حصہ ہے؟ اللہ نے تجھ پر بہت سارے احسانات کئے ہیں اسی طرح تو بھی لوگوں کے ساتھ بھلائی کر اور فتنہ وفساد سے گریز کر۔ اس لیے کہ خدا کو فسادی سخت ناپسند ہیں۔"

اس سب کے جواب میں:

﴿ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰي عِلْمٍ عِنْدِيْ ۭ﴾ (۲۸/ القصص:۷۸)

"اس نے کہا (تھا) یہ ساری دولت میرے ہنر کا نتیجہ ہے۔"

یہ فسطائی ذہنیت

قارون کے رنگ میں رنگ جانے والوں کا حال یہی ہوتا ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی دولت ان کی اپنی محنت اور تدبیر کا نتیجہ ہے اور بلا شرکت غیرے وہ اس کے مالک ہیں، ہاں اگر کبھی فقیر کو کچھ دیدیں تو یہ ان کی شرافت خیال کرنی چاہیے۔ ان کا بنیادی تخیل یہ ہے کہ قدرت نے کمانے یا گنوانے کی صلاحیت ہر کسی کو دی ہے، اب جو گنوانے پر کمر بستہ ہوں

گے تو اس کے جوابدہ وہ خود ہوں گے، دوسروں کا اس میں کیا قصور؟ دوسرے بھی کہاں تک ان کا بوجھ اٹھائیں گے؟ رہا یہ سوال کہ از راہ ہمدردی اگر کوئی انہیں خیرات دے دے تو یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے، نہ کوئی اس سے باز پرس کر سکتا ہے، نہ ہی دینے کے لیے جبر کر سکتا ہے۔

سرمایہ داری کا یہ وہ بھیانک تخیل ہے، جو سب سے پہلے یورپ میں رونما ہوا اور آج تک یہ براعظم اس کی لپیٹ میں ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو سماج اس قسم کی ذہنیت کا شکار ہو وہاں مفلسوں کا پرسانِ حال تلاش کرنا یا ان کے لیے کسی قسم کے حقوق کا مطالبہ کرنا بے سود ہوگا۔

اس میں شک نہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام اپنے آغاز (یعنی اٹھارہویں صدی عیسویں کے اواخر سے) ہی انتہا درجہ کی خودسری اور سنگدلی کے سبب کافی بدنام رہا۔ اس طبقے کو نہ بچوں پر رحم آیا، نہ عورتوں پر، حد یہ کہ انہوں نے معصوم بچوں اور بے بس عورتوں کو کم اجرت اور لمبی ڈیوٹی کے لیے کارخانوں میں دھکیل دیا، جہاں بیچارے پیٹ کی آگ بجھانے اور دو وقت کی روٹی کے لیے اپنی طاقت سے کہیں زیادہ مشقت کرنے پر مجبور رہیں، لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا جب کہ عالمی جنگ، ذہنی انقلاب، نئے تقاضوں اور دنیا میں جگہ جگہ سوشلسٹ اصولوں کی گونج نے اس طبقہ کو اپنے اندر تبدیلی لانے پر مجبور کر دیا، چنانچہ سرمایہ داروں نے کمزوروں اور اپاہجوں کے کچھ حقوق تسلیم کئے، پھر مختلف یونینوں اور قانونی مداخلت کی وجہ سے رفتہ رفتہ اس میں اضافہ ہوتا رہا، اب تک اس مقصد کے لیے انشورنس، اور پنشن جیسی اسکیمیں وجود میں آ چکی ہیں، انشورنس میں آدمی اپنی آمدنی کا کچھ حصہ کمپنی میں جمع کراتا ہے جو آگے چل کر یک مشت اسے مل جاتا ہے، اس لیے کم آمدنی والے کم پاتے ہیں جبکہ زیادہ ضرورت مند یہی ہوتے ہیں۔ پنشن اسکیم میں گورنمنٹ خود اپاہجوں اور حاجت مندوں کو قومی فنڈ سے ترتیب وار امداد دیتی ہے اور ان سے کسی قسم کا مطالبہ نہیں کیا جاتا۔

مارکسسٹ کمیونسٹوں کے نزدیک

اس پارٹی کا نظریہ، یہ ہے کہ غریبی کا انسداد اور غریبوں کے ساتھ انصاف اسی وقت ممکن ہے جبکہ سرمایہ دار طبقے کا نام و نشان مٹا دیا جائے اور ہر ممکن طریقے سے ان کی

دولت چھین لی جائے، اس لیے یہ مرض انہیں کا لایا ہوا ہے، اس مقصد کے لیے وہ ضروری سمجھتے ہیں کہ پسماندہ طبقے کو ان کے خلاف یورش کرنے کے لیے اکسایا جائے۔ ان کے دلوں میں بغض وحسد کی آگ جلائی جائے، تا کہ یہ خود ان سے لڑ کر اپنے حقوق حاصل کر لیں، پھر نتیجہ بھی بہر صورت انہیں کے حق میں نکلے گا۔ اس لیے کہ "پرولتاری" یعنی محنت کش مزدور اکثریت میں ہونے کی وجہ سے مٹھی بھر سرمایہ داروں پر حاوی ہوں گے اور آخری فتح یقیناً ان ہی کی ہوگی۔

علاوہ ازیں یہ پارٹی انفرادی اور نجی ملکیت کی سخت مخالف ہے، ان کا فیصلہ ہے کہ پیداوار کے جملہ ذرائع، خصوصا زمین، فیکٹری اور اس کے کل پرزے کسی فرد کی ملکیت میں نہ رہیں۔

سوشلسٹ انقلاب کے حامیوں اور کمیونسٹوں کے خدوخال یہ ہیں، اشتراکی ذہنیت کی شکار ہر پارٹی خواہ اعتدال پسند رجحان کی حامی ہو، یا انتہا پسند کی، یہ بات ان سب میں مشترک ہے کہ انفرادی ملکیت کا بہر صورت خاتمہ ہو، خواہ اس کے لیے جنگ ہی کیوں نہ کرنی پڑے؟ اس لیے کہ ان کی نظر میں سارے فتنے یہیں سے سر اٹھاتے ہیں، البتہ جنگ کا طریقہ ہر کسی کا مختلف ہے، بعض دستوری اور جمہوری اصولوں کے ذریعہ اس جنگ کو لڑنا چاہتے ہیں اور بعض سڑکوں اور چوراہوں پر اس مسئلے کو حل کرنا چاہتے ہیں۔

جارج بورگن اور بیرا مپیر، اپنی کتاب "سوشلزم یہ ہے" میں لکھتے ہیں:

> "کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ "سوشلزم" شخصی آزادی اور فرد کے اکرام کی حمایت کرتا ہے، لیکن دوسرے اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے، بلکہ سوشلزم یہ چاہتا ہے کہ پیداوار کے جملہ ذرائع قومیا لیے جائیں اور محنت کش مزدوروں کی بالادستی پورے طور پر سماج پر قائم ہو۔"

لیکن ہمیں ان سرد وگرم مباحث میں پڑنے کی چنداں ضرورت نہیں، اس لیے کہ ہم جانتے ہیں کہ سوشلزم کے بارے میں یہ متضاد خیالات قدیم سے چلے آ رہے ہیں۔

چنانچہ میکسیم لوروا اپنی کتاب "فرانسیسی سوشلزم کے قائدین" میں لکھتا ہے:

''اس میں شک نہیں کہ سوشلسٹ نظریات میں خاصا اختلاف ہے، چنانچہ بابوف اور برودن کے نظریوں میں فرق ہے، سن سیمن اور برودن کے افکار، بلانکی کے نظریات سے جداگانہ ہیں۔ پھران سب کے خیالات اور لوئیس بلن، کے فورلی اور بیکر کے افکار میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ غرض ہر گروپ اور مکتب فکر میں سخت ٹکراؤ اور تصادم ہے، لیکن قدر مشترک کے طور پر کسی ایک نظریے پران تمام کا کامل اتفاق ہے تو وہ یہ کہ نجی ملکیت کا بہر صورت خاتمہ ہو، جو جملہ خرابیوں کی جڑ اور تمام سماجی نامساوات کی بنیاد ہے۔'' (هذه هي الاشتراكية، ص: ۱۳)

رہا شورش پسند انقلابی سوشلزم، یا لادینی سوشلزم، یا مارکس ازم، تو اس میں شک نہیں کہ ان نظریوں اور کمیونسٹ نظریات میں کوئی خاص فرق نہیں۔ اس لیے کہ دونوں کی بنیاد انسان اور اس کی زندگی کے بس مادی وسائل اور ذرائع پر ہے۔ اس سے ہٹ کر ان کے نزدیک دوسرا کوئی موضوع نہیں۔ نیز اس میں شک نہیں کہ بھانت بھانت کے یہ سارے سوشلسٹ نظریے دین کے کٹر دشمن ہیں۔ ان کی تمام تر کوشش یہ ہے کہ روزمرہ کی زندگی میں مذہب کا گزر نہ ہو اور اگر حکومت قائم ہو تو اس کی بنیاد الحاد ولادینیت پر ہو۔ کمیونزم خونریزی، تصادم، شورش اور ہنگامے پر یقین رکھتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اخلاقی قدروں کو بزور پامال کر دیا جائے۔

پروفیسر عبداللہ عنان لکھتے ہیں:

''کمیونزم اور سوشلزم کی راہیں قطعی ایک ہیں۔ سوشلسٹ نظریات آگے چل کر کمیونزم کا روپ دھار لیتے ہیں۔ انقلابی سوشلزم، کمیونسٹ نظریات کا دوسرا نام ہے۔ ان میں فرق بس طریق کار اور بعض جزئی صورتوں میں ہے، لیکن جہاں تک حقائق کا تعلق ہے یہ صحیح ہے کہ کمیونزم خالص ہنگامہ آرائی اور توڑ پھوڑ پر یقین کرنے والا نظریہ ہے۔ اس کے پروگرام میں کسی سنجیدہ یا معقول وسائل کا استعمال یکسر مفقود ہے۔ جب کہ اعتدال پسند سوشلزم انہیں ایک حد تک قبول کرتا ہے۔ قصہ کوتاہ کہ کمیونزم جبر وتشدد، جوڑ توڑ کی سیاست اور شورش پسندی پر عقیدہ رکھتا ہے۔'' (المذاهب الاجتماعية الحديثة، ص: ۹۵)

☆...... اسلام مسیحی موقف کا مخالف ہے۔

☆...... غربی ایمان کے لیے خطرہ ہے۔

☆...... غربی کا اثر اخلاق پر

☆...... غربی کا اثر افکار انسانی پر

☆...... غربی کا اثر خاندان پر

☆...... سماج پر اثرات

☆...... جبریہ سے اختلاف

☆...... قسمت کا بہانہ اور تقدیر کا صحیح مفہوم

☆...... قناعت کا غلط مفہوم

☆...... قناعت کیا ہے؟

☆...... غربی اور خیرات

☆...... اسلام سرمایہ داروں کے نظریے کا مخالف ہے

☆...... اشتراکیت اور اسلام

☆...... خلاصہ

اسلام مسیحی موقف کا مخالف ہے

اسلام غریبی اور خوشحالی سے متعلق عجیب وغریب مسیحی موقف کی مخالفت کرتا ہے، ہمارے جو نام نہاد صوفیا، ایرانی، بھارتی، مسیحی یا اور کسی انتہا پسند نظریے سے متاثر ہیں، اسلام انہیں بھی ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے، اس لیے کہ قرآن پاک کی کسی آیت یا صحیح احادیث کے کسی ایسے ٹکڑے کی نشاندہی نہیں کی جاسکتی ہے جس میں غربت وافلاس کو سراہا گیا ہو۔

اب رہیں وہ حدیثیں جن میں زہد وتقویٰ وپرہیز گاری اور دنیا سے کنارہ کشی کی تعریف کی گئی، تو یہ واقعہ ہے کہ غریبی اور ناداری کی تعریف سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں، اس لیے کہ دنیا سے کنارہ کش اسی آدمی کو سمجھا جاسکتا ہے جس کے پاس پیسہ ہو، لیکن وہ اسی کا نہ ہو رہے، جو روپیہ اپنی مٹھی میں دبالے، لیکن دل کی گہرائی میں اسے جگہ نہ دے، وہ آدمی تارک الدنیا اور زاہد کہلانے کا مستحق کیوں کر ہوگا، جس کے پاس پھوٹی کوڑی تک نہ ہو۔

اس کی بجائے اسلام دولت کو ایسی نعمت سمجھتا ہے، جسے خداوند عالم بطور احسان بندوں کے سامنے گنواتا ہے اور اس کا شکریہ ادا کرنے کا حکم دیتا ہے، اور غریبی کو پیچیدہ مسئلہ ہی نہیں بلکہ ایسی مصیبت قرار دیتا ہے، جس سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیے، ساتھ ہی اسلام اس کے لیے ایسے وسائل تجویز کرتا ہے، جس سے اس کا علاج ممکن ہو سکے۔

جہاں تک دولت کے نعمت ہونے کا تعلق ہے، باری تعالیٰ خود اپنے رسول سے بطور احسان فرماتا ہے:

﴿ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَأَغْنَىٰ ۝ ﴾ (۹۳/ الضحیٰ:۸)

''اور اللہ نے آپ کو نادار پایا، پس مالدار بنادیا۔''

دوسری جگہ دولت کو بندۂ مومن کے اعمال کا فوری اجر قرار دیتے ہوئے حضرت نوح علیہ السلام کی زبانی ارشاد فرمایا:

﴿فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝ يُّرْسِلِ السَّمَاۗءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۝ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ۝﴾ (۷۱/ نوح: ۱۰، ۱۱، ۱۲)

''اور میں نے کہا کہ تم اپنے پروردگار سے گناہوں کی معافی مانگو، بے شک وہ بڑا بخشنے والا ہے، کثرت سے تم پر بارش بھیجے گا اور تمہارے مال و اولاد میں برکت دے گا، تمہارے لیے باغات لگائے گا اور نہریں جاری کرے گا۔''

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

''حلال کمائی نیک بندوں کا بہترین سرمایہ ہے۔'' (احمد، طبرانی)

اسیرانِ بدر کے متعلق آپ ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے قرآن پاک نے ارشاد فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ﴾ (۸/ الانفال: ۷۰)

''اے نبی (ﷺ) اپنے قیدیوں سے کہہ دیجیے، اللہ تعالیٰ دیکھے گا اگر تمہارے دلوں میں ایمان معلوم ہوگا تو جو کچھ تم سے لیا گیا ہے اس سے بہتر تمہیں دے گا۔''

یعنی دل نیک اور ایمان سے لبریز رہا تو قید سے رہائی کے لیے جو کچھ لیا گیا اس پر حسرت کی کیا ضرورت؟ اس سے کہیں زیادہ اور پاکیزہ دولت انہیں مستقبل میں حاصل ہو سکتی ہے۔ علاوہ ازیں معتبر احادیث بھی غریبی اور اس سے پیدا شدہ خرابی کو ایمان، اخلاق اور فکر و نظر کے لیے، اسی طرح انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے زبردست خطرہ قرار دیتی ہیں، جیسا کہ آیندہ سطروں سے معلوم ہوگا۔

غریبی ایمان کے لیے خطرہ ہے

یہ حقیقت ہے کہ غریبی دین و ایمان کے لیے سخت خطرناک ہے، خصوصاً ایسی جگہ

جہاں دولت کی فراوانی ہو، یہ خطرہ اس وقت ہوتا ہے جبکہ غریب جفاکش اور محنتی ہو اور اس کا دولت مند پڑوسی انتہائی کاہل اور سست ہو، ایسے حالات میں غریب لامحالہ اس وسوسہ کا شکار ہو جاتا ہے کہ خدا اس کے ساتھ رزق کی تقسیم میں امتیاز اور جانبداری برت رہا ہے۔ (نعوذ باللہ)

چنانچہ کسی عرب شاعر نے ایسے ہی موقعہ کے لیے کہا ہے:

كم عالم عالم اعيت مذاهبه　　و جاهل جاهلٍ تلقاهُ مَرزوقًا

هٰذا الذی یترك الالباب حائرةً　　و صیّر العالم النحریر زندیقًا

”بہت سارے ہنر والے تھک ہار کر بیٹھ رہے، لیکن ان کے مقابلے میں ان پڑھ اور جاہل خوشحال ہو گئے۔ بلا شبہ غریبی وہ لعنت ہے، جو عقل کو ششدر اور اچھے اچھوں کو بے دین بنا دیتی ہے۔“

اور اگر نوبت یہاں تک نہ آئے تب بھی اتنا ضرور ہوتا ہے کہ ایک برخود غلط تعطل ہی دل میں بیٹھ جاتا ہے۔

چنانچہ شاعر کہتا ہے:

الرزق كالغیث بین الناس منقسم　　هٰذا غریق وهٰذا یشتهی المطرا

یسعی القوی فلا ینال بسعیه　　حظا و یحظی عاجزو مهین

”روزی لوگوں میں بارش کی طرح برستی ہے، کوئی اس میں شرابور ہو جاتا ہے اور کوئی قطرہ کو ترس جاتا ہے، جفاکش اور محنتی، سخت دوڑ دھوپ کے بعد بھی محروم رہ جاتا ہے اور کاہل غبی ڈھیروں اکٹھا کر لیتا ہے۔“

عقیدے کی اس خرابی کو دیکھ کر ہمارے اسلاف نے کہا ہے، جب غریبی کسی بستی کا رخ کرتی ہے تو بے دینی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیتی ہے۔ حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ”بے صبرے اور فاقہ کش بدترین کافر ثابت ہوتے ہیں اور یوں بھی صبر کا مادہ لوگوں میں کم ہی ہوتا ہے۔“

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث اپنی جگہ بالکل درست ہے، جس میں آپ نے فرمایا:

((كَادَ الْفَقْرُ اَنْ يَّكُوْنَ كُفْرًا)) [1]

---

[1] مشكوٰة، كتاب الآداب، باب ما ينهى عنه من التهاجر، رقم: ٥٠٥١۔

* عراقی نے اس کی سند کو ضعیف بتایا ہے۔

"قریب ہے کہ غریبی کفر تک پہنچا دے۔"

ایک حدیث میں آپ ﷺ نے کفر اور فقر دونوں سے پناہ مانگی۔

((اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْكُفْرِ وَالْفَقْرِ)) [1]

ایک دعا میں آپ ﷺ نے فرمایا:

((اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْفَقْرِ وَالْقِلَّةِ وَالذِّلَّةِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ اَنْ اَظْلِمَ اَوْاُظْلَمَ)) [2]

'اے اللہ! میں ذلت اور ناداری اور ظالم یا مظلوم بننے سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔"

غریبی کا اثر اخلاق پر

غریبی کی وجہ سے جس طرح دین برباد ہوتا ہے۔ اسی طرح سیرت بھی جاتی ہے اور آدمی ناداری اور افلاس کے ہاتھوں مجبور ہو کر بھی وہ سب کر گزرتا ہے، جسے نہ عقل سلیم گوارا کرتی ہے، نہ ہی انسانی شرافت اور مروّت اسے پسند کرتی ہے۔ خصوصاً ایسی جگہ یہ واقعات زیادہ پیش آتے ہیں، جہاں غریب طبقہ خود کو اس مصیبت میں زیادہ ہی گرفتار پاتا ہے اور اس کے پڑوسی آسودہ اور خوشحال ہوں، اسی لیے مشہور ہے کہ "پیٹ کی پکار کے آگے ضمیر کی آواز دب جاتی ہے۔"

اور یہ مشاہدہ ہے کہ غریبی کے دباؤ سے متاثر ہو کر آدمی اخلاقی قدروں اور اس کے پیمانوں کو بھی بدل ڈالتا ہے اور دین و مذہب کی اس کی نظر میں کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ مزید برآں اس کا ذہن وساوس اور شکوک کی وادی میں سرگرداں اور حیران ہو جاتا ہے۔

[1] نسائی، کتاب الاستعاذۃ، باب الاستعاذۃ من الفقر، رقم: ٥٤٦٧؛ مسند احمد: ج٥/ ٣٦، رقم الحدیث ١٩٨٦٨؛ ابوداود، کتاب الأدب، باب مایقول اذا أصبح، رقم: ٥٠٩٠۔

[2] نسائی، کتاب الاستعاذۃ، باب الاستعاذۃ من الذلة، رقم ٥٤٦٤؛ ابوداود، کتاب الوتر، باب فی الاستعاذۃ، رقم: ١٥٤٤؛ ابن ماجه: کتاب الدعا، باب مایدعو به الرجل اذا خرج من بیته، رقم ٣٨٨٤۔

چنانچہ سرور دو عالم ﷺ نے انسانی کردار پر غریبی سے پیدا شدہ اثرات اور اس کے دباؤ کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

((خُذُوا الْعَطَاءَ مَادَامَ عَطَاءً فَإِذَا صَارَ رِشْوَةً عَلَى الدِّيْنِ فَلَا تَأْخُذُوْهُ وَلَسْتُمْ بِتَارِكِيْهِ تَمْنَعُكُمُ الْحَاجَةُ وَالْفَقْرُ)) ❶

''ہدیہ کی حد تک نذرانہ قبول کر سکتے ہو اور اگر رشوت کا شائبہ ہونے لگے تو مت لو، اگرچہ ضرورت اور غریبی کے سبب اس کا چھوڑنا دشوار معلوم ہو۔''

ایک حدیث میں قرض خواہ کی ہیئت کذائی بیان کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ الرَّجُلَ اِذَا اَغْرَمَ حَدَّثَ فَكَذَبَ وَوَعَدَ فَأَخْلَفَ)) ❷

''کوئی شخص قرض لینے کے لیے جب منہ کھولتا ہے تو قسم قسم کے بہانے کرتا ہے، پھر جب دینے کا وعدہ کرتا ہے تو اسے پورا نہیں کرتا۔''

غریبی کے سبب بدکاری اور فارغ البالی کے نتیجے میں گناہوں سے حفاظت نصیب ہوتی ہے، اس فرق کو بیان کرتے ہوئے آپ ﷺ نے ایک واقعہ سنایا:

''ایک شخص نے رات کے اندھیرے میں کسی کو خیرات دی، اتفاق سے وہ آدمی چور نکلا، صبح ہوئی تو لوگوں میں اس کا چرچا ہوا، دوسری بار محتاج جان کر اس نے ایک عورت کو خیرات دے دی، اتفاق سے یہ عورت زانیہ نکلی، دوسرے دن پھر چرچا ہوا کہ رات فلاں شخص نے اس فاحشہ کو خیرات دی، رات میں اس شخص نے خواب میں کسی کو کہتے سنا تم خاطر جمع رکھو، ہوسکتا ہے جس چور کو تم نے خیرات دی ہے، وہ چوری سے توبہ کر لے، یا وہ فاحشہ عورت تمہاری خیرات پا کر بری عادت چھوڑ دے۔'' ❸

---

❶ معجم الطبرانی الکبیر: ج ۲۲ ص ۳۰۶، رقم ۸۹۴۔(سنده ضعیف)

❷ بخاری، کتاب الأذان، باب الدعاء قبل السلام، رقم: ۸۳۲؛ نسائی، کتاب السهو، باب التعوذ فی الصلاة، رقم: ۱۳۱۰؛ ابوداود، کتاب الصلاة، باب الدعاء فی الصلاة، رقم: ۸۸۰؛ مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلاة، باب ما یستعاذ منه فی الصلاة، رقم: ۱۳۲۵۔

❸ الترغیب والترهیب، کتاب الصدقات، باب ما ورد فی فضل الصدقة و ان قلت ج ۲ ص ۱۵؛ نسائی، کتاب الزکاة، باب اذا أعطاها غنیا وهو لا یشعر، رقم: ۲۵۲٤؛ بخاری، کتاب الزکاة، باب اذا تصدق علی غنی و هو لا یعلم، رقم: ۱٤۲۱؛ مسلم، کتاب الزکوة، باب ثبوت أجر المتصدق وإن وقعت الصدقة فی ید فاسق، رقم: ۲۳٦۲۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غریبی، چوری اور فحاشی کا راستہ بتاتی ہے، اور قدر کفاف روزی ان گناہوں سے حفاظت کا باعث ہوتی ہے۔

غریبی کا اثر افکار انسانی پر

یہ امر مسلم ہے کہ غریبی کا اثر بد انسان کی روح اور اس کی سیرت تک محدود نہیں رہتا، بلکہ اس کے افکار و خیالات بھی بڑی حد تک اس سے متاثر ہوتے ہیں، اسی لیے جن غریبوں کو اپنی اور اپنے اہل و عیال کی ضرورت کی چیزیں میسر نہیں آتیں ان کے لیے کسی بھی مسئلے پر یکسو ہو کر سوچنا درحقیقت ممکن نہیں ہوتا، خصوصاً ایسے وقت میں جب کہ اس کے پڑوسی اس سے بدرجہا بہتر ہوں۔

چنانچہ محمد بن حسن شیبانی کی طرف یہ حکایت منسوب ہے کہ ایک دن بیٹھے مسائل حل کر رہے تھے، اتنے میں باندی نے گھر میں آٹا نہ ہونے کی شکایت کی، امام محمد نے جھنجلا کر فرمایا...... ''تیرا ناس ہو، تو نے بیسیوں مسائل میرے ذہن سے نکال دیئے۔''

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا: ''جس کے گھر میں کھانے کو نہ ہو اس سے مشورہ نہ لو!'' یہ اس لیے کہ اس کے خیالات پراگندہ ہوتے ہیں اور یہ نفسیاتی مسئلہ ہے کہ ذہنی ہیجان اور جذبات کی رو میں بہنے والے کی رائے پختہ نہیں ہوا کرتی، چنانچہ اس حدیث شریف سے اس بات کی تائید ہوتی ہے، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَا يَقْضِي الْقَاضِي وَهُوَ غَضْبَانٌ)) [1]

''غصہ کی حالت میں قاضی کو کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔''

فقہائے امت نے غصے پر قیاس کرتے ہوئے بھوک پیاس اور اسی قسم کے دیگر

[1] بخاری، کتاب الأحكام، باب هل يقضي القاضي وهو غضبان، رقم: ٧١٥٨؛ مسلم، كتاب الأقضيه، باب كراهة قضاء القاضي و هو غضبان، رقم: ٤٤٩٠؛ ترمذی، کتاب الاحكام باب لا يقضي القاضي وهو غضبان، رقم: ١٣٣٤؛ ابوداود، كتاب القضاء، باب القاضي يقضي وهو غضبان، رقم٣٥٨٩؛ نسائی، کتاب آداب القضاة، باب النهي عن أن يقضي في قضاء بقضاء ين، رقم٥٤٢٣؛ ابن ماجه، كتاب الاحكام، باب لا يحكم الحاكم وهو غضبان، رقم: ٢٣١٦۔

زوداثر عوامل پر بھی یہی حکم عائد کیا ہے۔

ایک شاعر اس کی توجیہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

اذا قل مال المرء قل بھاءُہٗ　　وضاقت علیه أرضه و سماءُہٗ

وأصبح لا یدری و ان کان داریاً　　اقدامه خیر له أم وراءُہٗ

''تہی دست ہونے پر آدمی بجھا بجھا سا رہتا ہے، زمین وآسمان اپنی فراخی کے باوجود اس کی نظروں میں تنگ ہو جاتے ہیں اور لیاقت وصلاحیت ہونے کے باوجود اسے مطلق پتہ نہیں چلتا کہ کر گزرنا اس کے لیے اچھا ہے، یا نہ کرنا۔''

غریبی کا اثر خاندان پر

غریبی خاندان کو مختلف پہلوؤں سے متاثر کرتی ہے، کبھی یہ اثرات اس وقت رونما ہوتے ہیں جب کہ خاندان کی تعمیر ہوتی ہے، یا اس کے بقا واستحکام کی، یا اسکے اندر شامل افراد میں میل جول پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

① سب سے پہلے خاندان کی تعمیر اور بناوٹ کو لیجیے، اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ شادی کے خواہشمند محض غریبی کی وجہ سے نکاح سے کتراتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک ان سے کہتا ہے:

﴿وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا حَتَّىٰ يُغْنِيَهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ﴾ (٢٤/ النور:٣٣)

''جو لوگ نکاح کی طاقت نہیں رکھتے، انہیں اس وقت تک ضبط سے کام لینا چاہیے جب تک اللہ انہیں اپنے فضل سے غنی نہ کردے۔''

یہ بھی مشاہدہ ہے کہ بعض لڑکیاں اور ان کے سرپرست اس لیے رشتے سے گریز کرتے ہیں کہ لڑکا ان کی منشا کے مطابق ہے لیکن غریب ہے! قرآن پاک نے اس سماجی روگ کی نشاندہی کرتے ہوئے اس پر تنقید کی ہے اور سرپرستوں کو تنبیہ کی ہے کہ رشتہ طے کرتے وقت سوجھ بوجھ سے کام لیں اور اس بات کا خیال رکھیں کہ لڑکے کے انتخاب میں تنہا جاہ وثروت ملحوظ نہ ہو، بلکہ حسن سیرت اور کردار کی پختگی بھی مدنظر ہونی چاہیے، اس لیے کہ اگر وہ مفلس ہوئے تو اللہ انہیں اپنے فضل سے غنی کرسکتا ہے۔ قرآن پاک کا ارشاد ہے:

﴿ وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ ۭ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ؀ ﴾

(٢٤/ النور:٣٢)

''جو بغیر نکاح کے ہیں، تم ان کا نکاح کر دیا کرو اور غلام اور لونڈیوں میں جو اس لائق ہو ان کا بھی، اگر وہ مفلس ہوں گے تو اللہ تعالیٰ ان کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا اور اللہ تعالیٰ وسعت والا اور خوب جاننے والا ہے۔''

② دوسرے نمبر پر خاندان کی بقا اور اس کے استحکام کو لیجیے، ہم دیکھیں گے کہ غریبی یہاں بھی اپنا اثر دکھاتی ہے اور ہر طرح کی اخلاقی رواداری کو بے اثر کر دیتی ہے۔ چنانچہ محض غریبی کی وجہ سے نباہ نہ ہونے کی صورت میں میاں بیوی ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جاتے ہیں یا الگ کر دیئے جاتے ہیں، جس کی خود اسلامی قانون بھی تائید کرتا ہے۔ چنانچہ قاضی کو اس بات کی اجازت ہوتی ہے کہ مرد مفلس ہو اور نان نفقہ نہ دے سکے تو بیوی کو اس سے علیحدہ کر دیا جائے، تاکہ اسے مزید تکلیف نہ ہو۔ ''نہ دکھ دو نہ خود سہو۔''

③ تیسرے نمبر پر خاندان میں شامل افراد کے درمیان باہمی روابط کو لیجیے، آپ دیکھیں گے کہ غریبی کی وجہ سے آباد گھر ویران ہو جاتا ہے اور انسان انسانیت کا جامہ اتار کر خون آشام درندہ بن جاتا ہے۔ قرآن پاک اسی بھیانک تاریخی حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے کہ بعضے صاحبِ اولاد اس قدر شقی القلب واقع ہوئے ہیں جو اپنے جگر گوشوں کو محض اس لیے فنا کے گھاٹ اتار دیتے ہیں کہ وہ غریب ہوتے ہیں یا انہیں یہ فکر دامن گیر ہوتی ہے کہ زیادہ بچوں کی پیدائش اور پرورش انہیں مفلس بنا ڈالے گی، یہ جرم انسانیت کی قبائے عظمت پر بدنما داغ ہے، جس پر انسانیت ہمیشہ سرنگوں رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نہ صرف اس کی مذمت کرتا ہے بلکہ اس واہمہ کو سرے سے باطل قرار دیتا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ ﴾

(٦/ الانعام:١٥١)

''اپنی اولاد کو ناداری کے سبب سے قتل نہ کرو، ہم انہیں اور تمہیں دونوں کو

رزق دیتے ہیں (انہیں قتل کر ڈالنا بڑا بھاری گناہ ہے)۔“

اس آیت میں ”ناداری کے سبب سے“ کا لفظ موجودہ ناداری کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جبکہ دوسری آیت میں ﴿ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ ﴾ کا لفظ موجود ہے جو خیالی اور وہمی غریبی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

﴿ وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ ۖ نَّحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ ۚ إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْئًا كَبِيرًا ۝ ﴾ (۱۷/ الاسرآء:۳۱)

”اور لوگو! اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل نہ کرو، (کیونکہ) ان کو اور تم کو ہم ہی رزق دیتے ہیں، بیشک اولاد کا قتل کرنا (بڑا) بھاری گناہ ہے۔“

غرض افلاس حقیقت میں ہو یا محض اسکا اندیشہ ہو، بہر صورت اس کی اجازت نہیں کہ آدمی ایسی حیا سوز حرکت کرے جو حسب ارشاد نبوی شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ ہے، چنانچہ روایت ہے کہ کسی نے آپ ﷺ سے پوچھا، سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ”خدا کے ساتھ اوروں کو شریک ٹھہرانا، حالانکہ تنہا اسی نے تم کو پیدا کیا ہے۔“ سائل نے عرض کیا، پھر کون سا گناہ سب سے بڑا ہے؟ فرمایا: ”پرورش کے خرچ سے بچنے کے لیے بچے کو قتل کر دینا۔“ [1]

ناداری سے متعلق یہ اسلامی نظریہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ انسان کی سیرت اور اس کے کردار اقتصادی اثرات اور اس کے نتائج سے کسی نہ کسی حد تک متاثر ہو جاتے ہیں، بلکہ کچھ تو اس دباؤ کے آگے خود کو اس قدر بے بس پاتے ہیں کہ شفقتِ پدری جیسے فطری جذبے تک کا گلا گھونٹ کر رکھ دیتے ہیں، لیکن پھر بھی اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان شاذ و نادر واقعات کو کلیہ قاعدے کا درجہ دے کر ہر دور، ہر ملک اور سب ہی انسانوں کے بارے میں ایک رائے قائم کر لی جائے۔ اس لیے کہ انسانی کردار اور اس کے باہمی روابط کو مضبوط بنانے کے لیے بہت سے نفسیاتی، سماجی اور مذہبی عوامل مصروف کار ہوتے ہیں۔ یہ

[1] بخاری، کتاب الأدب، باب قتل الولد خشية ان يأكل معه، رقم: ۶۰۰۱؛ مسلم، کتاب الایمان، باب بیان کون الشرك اقبح الذنوب وبيان اعظمها بعدهٗ، رقم: ۲۵۷؛ ترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب ومن سورة الفرقان، رقم: ۳۱۸۳؛ ابوداود، کتاب الطلاق، باب فی تعظیم الزنا، رقم: ۲۳۱۰۔

اس کا اثر ہوتا ہے کہ باشعور افراد اس قسم کی انسانیت سوز اور گھناؤنی حرکتوں سے قطعی نفرت کرتے ہیں۔ ہاں! سردست اس تلخ حقیقت کو بے نقاب کرنے سے ہمارا مقصد بس یہ دکھانا تھا کہ غریبی کے ہاتھوں تنگ آ کر آدمی اپنی اولاد کو زندہ درگور کرنے سے بھی نہیں چوکتا۔

سماج پر اثرات

پچھلے خطرات سے قطع نظر سماج کی سلامتی اور سماجی قدروں کی تعمیر کی راہ میں غریبی زبردست رکاوٹ کا باعث ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''مجھے ڈر ہے کہ تہی دست اور فاقوں کا مارا بھوک سے تنگ آ کر قتل و غارت گری کا پیشہ نہ اپنا لے۔'' پھر یہ تو ممکن ہے کہ آبادی کی کثرت کے سبب روزگار ناپید ہونے اور غریبی کے آثار رونما ہونے پر آدمی صبر کر لے، لیکن اگر غریبی کا اصل سبب یہ ہے کہ دلوں میں خود غرضی اور ایک دوسرے کے مقابلے میں برتری اور عناد کے جذبات گھر کر چکے ہوں، یا دولت کی صحیح تقسیم اور گردش مفقود ہو کر چند خاندانوں کی بالا دستی پورے معاشرے پر قائم ہو گئی ہو تو ان حالات میں یقینی طور پر جذبات مشتعل ہوں گے، ہنگامے اور فساد رونما ہوں گے اور باہمی اخوت اور پیار و محبت کے رشتے تار تار ہو جائیں گے۔

اس میں شک نہیں کہ جب تک سماج میں اونچ نیچ رہے گی، جب تک اونچے اونچے محلات اور پست جھونپڑے ہوں گے، دولت کے انبار اور غریبی کے گہرے غار، حد سے زیادہ شکم سیری اور انتہا درجے کی فاقہ مستی رہے گی، اس وقت تک دلوں میں بغض و حسد کی آگ سلگتی رہے گی اور سرمایہ داروں اور غریبوں کے درمیان وسیع خلیج حائل رہے گی، پھر وہ وقت بھی آئے گا جب کہ ان ہی فاقہ مستوں اور خانماں برباد لوگوں کے درمیان سے تخریب پسند اور قانون کو پاش پاش کرنے والے عناصر پیدا ہوں گے، یہی نہیں بلکہ غریبی سے پیدا شدہ یہ خطرہ قوم کی لیڈر شپ اور خود ملکی آزادی کو بھی پوری شدت سے لاحق ہوگا۔ اس لیے یہ طے ہے کہ ایک فاقہ زدہ اور مصیبت کا مارا اپنے وطن سے دفاع کا کوئی ولولہ اپنے دل میں موجود نہیں پائے گا۔ اس کے وطن کی زمین اس کے لیے نہ غلہ اگاتی ہے، نہ خوف و ہراس میں اسے امن و سکون دیتی ہے، اور نہ ہی اس کے اندر بسنے والی قوم میں تباہی کے مہیب

غار سے اسے نجات دینا چاہتی ہیں۔

ایسے حالات میں آدمی اس قماش کے ظالم اور طوطا چشم وطن کو بچانے کے لیے کسی قسم کی قربانی دینا کیوں گوارا کرے گا؟ وہ خود کو قربانی کا بکرا بنانا کیوں پسند کرے گا۔ جب کہ دودھ اور گھی میں حصہ لگانے والے اچھے دوسرے نظر آئیں گے؟

وَاِذْ تَكُوْنُ كَرِيْهَةٌ اُدْعٰى لَهَا وَاِذَا يُحَاسُ الْحِيْسُ يُدْعٰى جُنْدُبُ

''جنگ کے موقعہ پر مجھے بلایا جاتا ہے اور جب بالیدہ بنایا جاتا ہے تو جندب کو دعوت دی جاتی ہے۔''

غریبی سے پیدا شدہ اس جیسی صدہا خرابیاں ہیں، کچھ ایسی ہیں جن کا اثر عام انسانی صحت پر پڑتا ہے، جو ناقص غذا اور گندی رہائش کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے۔ کچھ ایسی ہیں جن کا اثر انسان کی نفسیات پر پڑتا ہے۔ جس کے نتیجے میں دلی بے چینی، چڑچڑاپن اور تند خوئی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ یہ اور اس طرح کی کوئی سی خرابی ہو اس میں شک نہیں کہ براہ راست زد آدمی کی آمدنی، اس کی بود و باش، اس کے سماج اور اس کے ذریعۂ معاش پر پڑتی ہے۔

جبریہ سے اختلاف

اسلام جس طرح اس مسیحی موقف کا مخالف ہے کہ ہمہ قسم کے مادی مسائل سے قطع نظر آدمی پورے طور پر جسمانی اذیت کا خوگر بن جائے اسی طرح جبریہ کا یہ نظریہ اس کی نظر میں بے بنیاد ہے کہ امیری اور غریبی کو تقدیر الٰہی کا ناقابل تنسیخ فیصلہ خیال کیا جائے اور صرف اس لیے کہ یہ فیصلہ اللہ کی مشیت اور اس کی رضامندی کے عین مطابق ہے۔ آدمی خود کو تقدیر کے حوالے کر دے اور ہر طرح کے علاج معالجے کا خیال دل سے نکال دے۔

درحقیقت یہ نظریہ ایسی رکاوٹیں پیدا کرتا ہے جس سے ظلم و زیادتی اور جھوٹے قوانین کی حکمرانی باقی رہے، انصاف اور ٹھوس انسانی قدروں کی بحالی کسی طرح ممکن نہ ہو سکے۔

ان حالات میں اسلام اور اس کے ماننے والوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ افلاس اور غربت کے شکنجوں سے انسان کو آزاد کرانے کی پرزور وکالت کریں۔ باعزت زندگی اور آزاد فطری ماحول میں افراد کو ان کے صحیح مقام پر فائز کریں، ساتھ ہی معاشرتی

آداب اور سماجی ذمہ داریوں کی حدود متعین کریں، مسلمانوں کا یہ اہم فریضہ ہے کہ وہ جبریہ کے ان غلط افکار سے جنگ کریں جس کی جڑیں طویل عرصے سے لوگوں کے دل ودماغ میں گھر کر چکی ہیں۔

حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ سرمایہ دار اندرونی خباثت اور تکبر میں آ کر اس نظریے کو اچھالتے ہیں اور پسماندہ طبقہ جہالت کی وجہ سے فریب کھا کر اسے مان لیتا ہے، نام نہاد دیندار افراد بھی ایسے نکل آتے ہیں جو منافقت یا غفلت کے سبب ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔

قرآن پاک نے شروع دن سے اس نظریہ کو اپنے سامنے موجود پایا۔ اس نے سرمایہ داروں کو اس بات کی دعوت دی کہ وہ اللہ کی دی ہوئی دولت کو اس کے بندوں پر خرچ کریں، ذمہ داری کا مزید احساس دلانے کے لیے اسلام نے غریبوں اور مسکینوں کے حقوق اور اس کی مقدار متعین کی، پھر جب تقدیر الٰہی اور اس کی مشیت کا سہارا لے کر اعتراضات ہوئے تو قرآن کریم نے ان اوہام اور خیالی دعوؤں کا انسداد کیا اور اسے کھلی ہوئی گمراہی قرار دے کر صاف اعلان کیا کہ

﴿ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ أَنفِقُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنُطْعِمُ مَن لَّوْ يَشَاءُ اللَّهُ أَطْعَمَهُ إِنْ أَنتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴾ (٣٦/ یس:٤٧)

”پھر جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کا دیا اس کے کمزور بندوں پر خرچ کرو تو یہ منکر ایمان والوں سے کہتے ہیں ہم ایسوں کو کیوں کھلائیں جنہیں اللہ چاہتا تو خود کھلاتا؟ تم صریح گمراہی میں پڑے ہو۔“

قسمت کا بہانہ اور تقدیر کا صحیح مفہوم

پھر اس سے بڑھ کر گمراہی اور کیا ہوگی کہ تقدیر الٰہی اور اس کی بنائی ہوئی قسمت کا مفہوم خود بیٹھ کر متعین کریں اور بزعم خود یہ سمجھ بیٹھیں کہ اللہ جب کسی غریب یا مسکین کو کھلانا چاہے گا تو آسمان سے روٹی سالن یا گھی اور شہد برسائے گا! حالانکہ یہ عقل وانصاف سے کام

لیتے تو ان کی سمجھ میں یہ بات آ جاتی کہ خدا کی جانب سے رزق کی تقسیم کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ان ہی میں سے کسی کو کھلانے والا بنا دیتا ہے اور کسی کو کھانے والا اور پھر واقعہ بھی یہی ہے، اس لیے کہ اگر کوئی باحیثیت کسی نادار کی کفالت کرتا ہے، تو درحقیقت یہ اللہ ہی کی طرف سے مل رہا ہے، ورنہ مشیت ایزدی کے بغیر مالدار کسی کو روٹی کا لقمہ بھی کیونکر مہیا کر سکتا ہے؟

اسلام پیروانِ اسلام کو یہ سبق سکھاتا ہے کہ ہر مشکل کا حل اور ہر مرض کی دوا دنیا کے اندر موجود ہے۔ جس خالق حقیقی نے امراض پیدا کیے ہیں، اسی نے اس کی دوا بھی پیدا کر رکھی ہے، اگر کسی کی تقدیر میں بیماری ہے تو شفایابی بھی اس کا نوشتۂ تقدیر بن چکی ہے۔ مشیت ایزدی اور تقدیر الٰہی کا مفہوم اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ درد بھی اس کی مشیت ہے، اور علاج بھی اس کی مشیت ہے۔ سچا مومن وہ ہوتا ہے جو تقدیر کو تقدیر سے بدل دیتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے بھوک اور پیاس کے آثار رونما ہونے پر آدمی اس کی خاطر خواہ تدبیر کرتا ہے۔ حالانکہ یہ بھوک پیاس اور اس کا وہ علاج سبھی چیزیں روز ازل سے تقدیر کے نوشتے میں موجود ہوتی ہیں۔

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کا ذکر ہے کہ شام میں ایک وبا پھوٹ پڑی، اتفاق سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس علاقے میں پہلے سے موجود تھے۔ جب آپ وہاں سے محفوظ مقام کی طرف چل پڑے تو کسی نے عرض کیا۔ امیر المؤمنین! کیا مشیت ایزدی سے فرار کا ارادہ ہے؟ آپ نے جواب دیا ہاں! ہم اللہ کی ایک مشیت سے نکل کر اسکی دوسری مشیت کی طرف جا رہے ہیں۔

عہد نبوی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے عرض کیا، دوا، علاج اور پرہیز کرنا کیسا ہے؟

هَلْ تُرَدُّ مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ شَيْئًا؟ قَالَ: ((هِيَ مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ)) [1]

کیا اس سے تقدیر بدل سکتی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا:

"(کیوں نہیں) وہ بھی تو اس کی مشیت ہوگی۔"

خلاصہ یہ ہے کہ اگر غریبی بیماری ہے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ نے اس کا علاج بھی تجویز کیا ہے اور اگر کسی کے لیے غریبی نوشتۂ تقدیر بن چکی ہے تو اس کا مقابلہ اور

---

[1] مسند احمد: ١/ ٤٤٦، رقم ٤٢٥٥؛ ابن ماجه، كتاب الطب، باب ما انزل الله داء إلّا أنزل له شفاء، رقم: ٣٤٣٧۔

اس سے نجات کی تدابیر بھی عین نوشتۂ تقدیر ہوں گی۔

قناعت کا غلط مفہوم

قناعت کی تعلیم جن احادیث سے ملتی ہے ان کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے کہ نادار آدمی کیڑے مکوڑوں جیسی زندگی بسر کرے اور حلال کمائی اور آسودہ زندگی کی مطلق تمنا بھی نہ کرے یا دولت منداس کے برعکس اسراف وفضول خرچی کرتا رہے، عیش وعشرت میں مست رہے اور یہ سمجھتا رہے کہ اللہ کو بھی یہی منظور ہے۔

قناعت کا یہ مفہوم اس لیے نہیں ہے کہ خود سرورِ عالم ﷺ کی ذات بابرکت اپنے رب سے غنا اور بے نیازی کی دعا بالکل اسی طرح کیا کرتی تھی جیسے تقویٰ اور پرہیز گاری کی زندگی طلب کرتی تھی۔

چنانچہ اپنے خادم اور صحابی حضرت انس رضی اللہ عنہ کے حق میں آپ نے دعا کی تھی:

((اَللّٰهُمَّ اَكْثِرْ مَالَهُ)) [1]

''خدایا! اس کی دولت میں برکت عطا فرما۔''

اپنے عزیز ترین رفیق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تعریف میں آپ ﷺ نے فرمایا:

((مَا نَفَعَنِيْ مَالٌ قَطُّ اِلَّا مَالُ اَبِيْ بَكْرٍ)) [2]

''ابوبکر رضی اللہ عنہ کی دولت سے زیادہ کسی کی دولت نے مجھے نفع نہیں پہنچایا۔''

اب یہ سوال ضرور پیدا ہوگا کہ پھر قناعت سے مراد کیا ہے؟ جواب یہ ہے کہ قناعت ان دو چیزوں کا نام ہے:

قناعت کیا ہے؟

① اول یہ کہ یہ واقعہ ہے کہ دنیا کی حرص اور لالچ فطری طور پر انسان کے اندر کوٹ کوٹ کر

[1] بخاري، كتاب الدعوات، باب دعوة النبي لخادمه، رقم: ٦٣٤٤؛ مسلم، كتاب فضائل الصحابه، باب من فضائل أنس بن مالك، رقم: ٦٣٧٢؛ ترمذی، كتاب المناقب، باب مناقب لأنس بن مالك، رقم ٣٨٢٩۔ [2] ابن ماجه، كتاب السنة، باب فضل ابى بكر الصديق رضی اللہ عنہ، رقم: ٩٤؛ مسند احمد: ٢/ ٣٦٦، رقم: ٨٥٧٢۔

بھری ہوئی ہے، آدمی جس قدر کماتا ہے، اس سے کہیں زیادہ کی حرص اس کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے، یہ حدیث اسی طرف اشارہ کرتی ہے کہ

((لَوْ کَانَ لِابْنِ اٰدَمَ وَادِیَانِ مِنْ ذَهَبٍ لَا بْتَغٰی ثَالِثًا وَلَا یَمْلَأُ عَیْنَ ابْنِ اٰدَمَ اِلَّا التُّرَابُ)) [1]

''ابن آدم کو اگر سونے سے بھری دو وادیاں مل جائیں، تو اس کے دل میں تیسری کی خواہش کروٹیں لے گی (اور ننانوے کا یہ پھیر یوں ہی چلتا رہے گا) یہاں تک کہ قبر کی مٹی اس کی آنکھوں کو بھر دے گی۔''

حرص کی اس یلغار کے مقابلے میں مذہب پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ دولت اور روزی کے حصول کا ایسا معتدل اور مناسب راستہ تجویز کرے جس سے انسان کا نفس اس کی زندگی سے ہم آہنگ ہو جائے اور اسے وہ سکون حاصل ہو جائے، جو سعادت کا سرچشمہ ہے، جس کے بعد وہ کبھی حرص و آز کی اس دلدل میں نہ جا پڑے جہاں موت کے لمبے سائے منہ کھولے اس کے منتظر ہوں۔

حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ:

((اِنَّ رُوْحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِیْ رَوْعِیْ اَنَّ نَفْسًا لَنْ تَمُوْتَ حَتّٰی تَسْتَکْمِلَ رِزْقَهَا فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَجْمِلُوْا فِی الطَّلَبِ)) [2]

''حضرت جبرائیل نے میرے کان میں یہ بات کہی کہ کوئی بھی آدمی اپنے حصے کی روزی حاصل کیے بغیر مر نہیں سکتا۔ اس لیے تم اللہ کا خوف دل میں رکھتے ہوئے ہر مناسب طریقے سے روزی کی تلاش میں لگے رہو۔''

---

[1] مسند احمد: ۱/ ۳۷۰، رقم: ۳۴۹۱؛ بخاری، کتاب الرقاق، باب مایتقی من فتنة المال، رقم ۶۴۳۶، ۶۴۳۷، ۶۴۳۸؛ مسلم، کتاب الزکاة، باب لو أن لابن آدم و ادیین لابتغی ثالثاً، رقم ۲۴۱۵، ۲۴۱۷؛ ترمذی، کتاب الزهد، باب لو کان لا بن آدم و ادیان من مال لابتغی ثالثًا، رقم: ۲۳۳۷۔ (بخاری حسب صراحت شیخ البانی لو کان له ثالث" کی روایت ثابت نہیں۔) [2] ابن ماجه، کتاب التجارات، باب الا قتصاد فی طلب المعیشه، رقم: ۲۱۴۴۔

اس ہدایت کی بجائے اگر اسلام یہ طریقہ اپناتا کہ انسان کو کسی قید و بند کے بغیر پوری آزادی سے حرص و آز کے پیچھے لگا دیتا تو اس میں شبہ نہیں کہ انسان سارے سماج کے لیے زبردست خطرہ بن کر ابھرتا، لیکن اس کے برعکس اسلام یہ سکھاتا ہے کہ انسان اپنی جولانی اور تمام تر توانائی، اخلاقی قدروں، پاکیزہ مقاصد اور جنت جیسی دائمی نعمت کے حصول میں صرف کرے۔ چنانچہ یہ آیتیں پکار پکار کر اس سے کہتی ہیں:

﴿وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ ۚ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ﴾ (۲۰/ طٰہٰ: ۱۳۱)

''اور مت بچھا اپنی نگاہیں ایسی چیزوں کے لیے جو ہم نے دنیاداروں کو چند دن کے فائدے کے لیے دی ہیں، ان میں لذّت کہاں؟ وہ تو سامان آزمائش ہیں، ہاں تیرے رب کے پاس موجود نعمتیں البتہ لازوال اور ابدی ہیں۔''

﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۗ ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَاللَّهُ عِندَهُ حُسْنُ الْمَآبِ ۝ قُلْ أَؤُنَبِّئُكُم بِخَيْرٍ مِّن ذَٰلِكُمْ ۚ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا عِندَ رَبِّهِمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَأَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللَّهِ ۗ﴾ (۳/ آل عمران: ۱۴، ۱۵)

''مرغوب چیزوں کی محبت نے لوگوں کو فریفتہ کر رکھا ہے، جیسے عورتیں بال بچے، سونے چاندی کے ذخیرے، نشان زدہ گھوڑے، مویشی اور تروتازہ کھیتیاں، حالانکہ ان کا نفع دنیا تک محدود ہے اور اللہ کے پاس موجود نعمتیں ان سے کہیں بہتر اور بے شمار ہیں۔ آپ (ﷺ) فرمادیجیے! کیا میں تم کو ایسی چیزیں بتلا دوں، جو ان چیزوں سے بدرجہا بہتر ہوں (سنو) ایسے لوگوں کے لیے جو اللہ سے ڈرتے ہیں، ان کے مالک حقیقی

کے پاس ایسے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں ان میں ہمیشہ رہیں گے اور ان کے لیے ایسی بیبیاں ہیں، جو صاف ستھری کی ہوئی ہیں اور ان کے لیے خوشنودی ہے اللہ کی طرف سے۔''

اسلام کا فرض منصبی یہی ہے کہ حرص وہوس اور بدنیتی کو دہکتا ہوا شعلہ قرار دے، تا کہ آدمی اس سے دور بھاگے، اسے ہاتھوں میں اٹھا کر غم واندوہ میں مبتلا نہ ہو جائے اور اس سے بڑھ کر رنج وغم اور کیا ہوگا کہ آدمی تھوڑے پر بس نہ کرے جس قدر زیادہ ملے اس سے کہیں زیادہ کی فکر میں گھلتا جائے اور جب اس کے پاس موجود مال اس کی تشنگی کو نہ بجھا سکے تو یہ غیروں کے مال ومنال کی طرف ندیدوں کی طرح للچائی ہوئی نظر ڈالے اور حلال کمائی سے سیری نہ ہونے پر حرام کمائی کے لیے اسکی رال ٹپکنے لگے۔

غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایسے ہی افراد تقدیر کے شاکی اور سدا کے لیے بے چین ہوا کرتے ہیں۔ ان کی مثال جہنم کی سی ہے جو بے شمار افراد کو ہڑپ کر لینے کے بعد بھی کیا اور ہیں؟ کیا اور ہیں؟ کی پیہم صدائیں لگاتی رہے گی۔ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ۔

قناعت اور قوت ایمانی کا تقاضا ہے کہ دلوں میں لافانی اور پاکیزہ دولت کی طلب ہو، آخرت کی پائیدار زندگی کی تڑپ دل میں کروٹیں لے اور اس مالک حقیقی سے اس کا رشتہ استوار رہے، جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

اسلام سکھاتا ہے کہ مالدار اگر مالدار کہلاتا ہے تو اس لیے نہیں کہ اس کے پاس دولت ہے یا راحت کے اسباب اس کے پاس مہیا ہیں، بلکہ حقیقی دولت وسکینت اور آسودگی ہے، جو اس کے دل میں موجود ہے، ورنہ جسے یہ دولت میسر نہ ہو اس کے لیے دنیا جہان کی راحتیں کس کام کی؟ چنانچہ یہ حدیث بتاتی ہے کہ

((لَيْسَ الْغِنٰى عَنْ كَثْرَةِ الْعَرَضِ اِنَّمَا الْغِنٰى غِنَى النَّفْسِ)) [1]

''مالدار، سیم وزر کی فراوانی سے مالدار نہیں کہلاتا، بلکہ سچا دولت مند وہ ہے

[1] بخاری، کتاب الرقاق، باب الغنی غنی النفس، رقم: ٦٤٤٦؛ مسلم، کتاب الزکاۃ، باب فضل القناعة والحث علیها، رقم ٢٤٢٠؛ ترمذی، کتاب الزهد، باب ان الغنی غنی النفس، رقم: ٢٣٧٣؛ ابن ماجه، کتاب الزهد، باب القناعة، رقم: ٤١٣٧؛ مسند احمد: ٢/ ٢٤٣، رقم ٧٢٧٤۔

جو دل کا غنی ہو۔“

② دوسری بات جو قناعت اور تسلیم و رضا کا مفہوم سمجھنے کے لیے ذہن نشین کرنی چاہیے، یہ ہے کہ رزق اور دوسری تمام نعمتوں میں فرق مراتب درحقیقت منشائے الٰہی کے عین مطابق ہے اور یہ وہ سنت الٰہی ہے، جو انسانی زندگی کے مزاج اور اس کے فرائض منصبی سے پورے طور پر ہم آہنگ بھی ہے اور اس کی خداداد صلاحیتوں اور قوت ارادی کی آزمائش کے لیے ازبس ضروری ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے:

﴿وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ﴾ (۱۶/ النحل:۷۱)

”تم جو روزی میں کسی سے کم اور کسی سے زیادہ ہو تو بس یہ اللہ کی طرف سے ہے۔“

دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿إِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ۚ إِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًاۢ بَصِيْرًا﴾ (۱۷/ الاسرآء:۳۰)

”تمہارا رب جس کے لیے چاہتا ہے رزق کے دروازے کھول دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے بند کر دیتا ہے۔ وہ اپنے بندوں کے جملہ حالات سے باخبر ہے۔“

ایک اور جگہ فرماتا ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ ۚ﴾ (۶/ الانعام:۱۶۵)

اس نے تمہیں زمین پر اپنا نائب بنایا اور یہ جو ایک دوسرے پر فوقیت دی تو اس لیے، تاکہ تمہاری آزمائش کرے۔“

پھر یہ بھی دیکھیے کہ دنیا ہی میں کوئی پست قد ہوتا ہے، کوئی سرو قد، کوئی بدصورت ہوتا ہے، کوئی پری وش، کوئی بلا کا ذہین ہوتا ہے کوئی نادان، لیکن اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا، بالکل اسی طرح یہ بھی کوئی ناقابل اعتراض بات نہیں ہونی چاہیے کہ کوئی دولت مند

رہے اور کوئی فاقہ مست، اس لیے کہ یہی زندگی کا مقتضیٰ اور خدا کی سنتِ متوارثہ کا منشا ہے۔ کمیونسٹ اور سماجی مساوات کا بلند بانگ دعویٰ کرنے والے خواہ سرتوڑ کوشش کریں، خواہ دنیا سر پر اٹھالیں۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ اس میں سرِ موفرق نہیں کرسکیں گے اس لیے کہ فطرت کے اصول بدلے نہیں جاتے۔

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ مسلمان سچی زندگی بسر کرنے کا خوگر ہو، نہ گہرے رنج میں مستغرق رہے، نہ طاقت کا بے جا استعمال کرے اور نہ موہوم اور جھوٹی آرزوؤں کے پیچھے آنکھیں بند کرکے چل پڑے۔

اسلام کی نظر میں ایک مسلمان کا امتیازی وصف یہ ہونا چاہیے کہ وہ دوسروں کی دولت پر حریصانہ نظریں نہ گاڑے۔ اس لیے کہ اس کا نتیجہ سوائے اس کے اور کیا نکلے گا کہ رشک وحسد کی آگ میں اس کا دل جل اٹھے گا، اور لالچ اس کی رگ رگ میں سما جائے گی۔

یہ مشاہدہ ہے کہ آدمی اپنی حرماں نصیبی اور دوسروں کی فارغ البالی کا بڑا گہرا اثر قبول کرتا ہے، اس کا توسن فکر مثبت سے کہیں زیادہ منفی راستوں پر سرپٹ دوڑتا ہے۔ حالانکہ اس کی بھلائی اس میں تھی کہ اسے آسودہ حال لوگوں کو نہ دیکھتے ہوئے ایسوں پر نظر کرنی چاہیے تھی جو اس سے کہیں زیادہ گئی گزری زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں، تاکہ اس کو راحت اور سکونِ قلب نصیب ہو۔

قناعت کا مفہوم اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ آدمی اسی دائرے کے اندر رہ کر بخوشی اپنی سرگرمیاں جاری رکھے، جس کی حدود خود اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے متعین کردی ہیں، پھر ان حدود کی پابندی بھی اسی انداز سے کرنی چاہیے کہ لاکھ چاہنے کے بعد بھی وہ اس کے حلقۂ اثر سے باہر نہ نکل سکے۔

قناعت اور قوانین فطرت کے دائرے میں محدود رہ کر اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کو یوں سمجھئے کہ ہر آدمی ہی ورثے میں کچھ ذہنی اور جسمانی توانائی پاتا ہے۔ پھر علم، ماحول اور وقت کے ساتھ ساتھ حاصل ہونے والے کچھ تجربات اسے فکرونظر کا مزید سرمایہ عطا کرتے ہیں۔ اب اگر یہ شخص اپنے لیے کسی قسم کا طریقہ کار متعین کرے تو اس کی بس بھر

کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنے قائم کردہ دائرے میں رہ کر اپنی جدوجہد کو باقی رکھے۔ چنانچہ اسے یہ فکر قطعاً نہیں ہوتی کہ نا قابل حصول اشیاء کو حاصل کرنے کے لیے سرگرداں رہے یا خیالی منصوبوں کے شیش محل تعمیر کرے، اس لیے کہ اسے بخوبی علم ہے کہ اس صورت میں اس کی مثال اس بوڑھے آدمی کی سی ہوگی جو بڑھاپے میں جوش جوانی کا طلبگار ہو یا بد صورت عورت حسن و جمال کی خواستگار ہو یا ناٹا پست قد، سرو قد نوجوان جیسا بننا چاہے۔ حالانکہ یہ ان کی پہنچ سے بھی بعید ہے۔ چنانچہ حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں عورتوں نے بھی اسی قسم کی ایک خواہش کا اظہار کیا تھا۔

انہوں نے دربار نبوی ﷺ سے درخواست کی تھی کہ مردوں کا سا اجر انہیں بھی حاصل ہو۔ لیکن جواب میں یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۭ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ۭ وَلِلنِّسَاۗءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۭ وَاسْــَٔـلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ﴾ (٤/ النسآء:٣٢)

''اس چیز کی خواہش مت کرو، جس میں اللہ نے ایک کو دوسرے پر فوقیت دی ہے۔ مردوں کا اپنی کمائی میں حصہ ہے اور عورتوں کا اپنی کمائی میں، ہاں اپنے رب سے اس کے فضل کی طلب ضرور کرو۔''

پھر قوموں کی زندگی میں کبھی تنگ دستی اور فاقہ مستی کا بھی ایک دور آتا ہے، کبھی جنگ یا بعض نامساعد حالات درپیش ہوتے ہیں، کچھ علاقے جغرافیائی لحاظ سے ایسی جگہ واقع ہوتے ہیں، جہاں خوشحالی یا آسودگی کے وسائل یکسر مفقود ہوتے ہیں حتی کہ وہاں کے باشندوں کے لیے حصول رزق یا نقل مکانی کے لیے بھی حالات سازگار نہیں ہوتے۔ ایسے ہمت شکن حالات میں اگر کوئی مفید دوا یا تیر بہدف علاج سودمند ہو سکتا ہے، تو سچ پوچھئے تو وہ یہی قناعت اور تسلیم و رضا کا نفسیاتی علاج ہے، اس لیے کہ اس علاج سے ہٹ کر اگر ان کی نگاہیں دوسروں پر مرکوز ہوں اور پھر وہ ان کا سا بننے کے لیے مفت میں اپنی جان کھپائیں تو اس کو کوئی بھی عالی ہمتی یا جانبازی سے تعبیر نہیں کر سکے گا۔ اس لیے کہ اس کی حیثیت بے

سود تمناؤں اور جھوٹی خواہشات سے کسی طرح کم نہ ہوگی، جس کا نتیجہ بہر صورت حرماں نصیبی اور نامرادی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ البتہ یہ تصور ان کے لیے قدرے تسلی کا باعث ہو سکتا ہے کہ وہ یقین کریں کہ خوشحالی کا راز اسباب راحت کی فراوانی میں مضمر نہیں بلکہ اصل خوشحالی یہ ہے کہ آدمی کا دل سکون اور چین محسوس کرے۔ ''سب سے بڑی دولت یہ ہے کہ بندہ اپنے رب کے فیصلے کو تسلیم کرتے ہوئے افراط و تفریط سے کلی پرہیز کرے۔'' [1] نیز آپ ﷺ نے اس شخص کو کامیاب انسان قرار دیا جس نے اسلام کی راہ اپنائی، بقدر ضرورت روزی پر اکتفا کیا اور صبر و قناعت کو اپنا شیوہ بنایا۔ [2]

یہ اس لیے کہ آدمی کو بقدر ضرورت چیز زیادہ فائدہ پہنچاتی ہے، ورنہ اسبابِ راحت کی فراوانی کس کام کی، جو اللہ کی یاد کو دل سے بھلا دے۔

ان الغنی هو الغنی بنفسه ولو انه عاری المناکب حاف

ما کل ما فوق البسیطة کافیا و اذا قنعت فبعض شئ کاف

''مالدار وہ ہے جو دل کا غنی ہو، خواہ اس کے تن پر کپڑا اور پیروں میں جوتا نہ ہو، قناعت پیشہ آدمی کے لیے تھوڑا بھی بہت ہے، اس لیے کہ یہ نہ ہو تو کل کائنات بھی ناکافی ہے۔''

خلاصہ یہ کہ آدمی بے انتہا حرص اور حد درجہ کی بدنیتی میں مبتلا نہ ہو، نہ ہی غیروں کی دولت یا ناقابل حصول چیزوں کی طلب میں رہے، بس اسی کا نام ''قناعت'' ہے جس کے ذریعہ آدمی خوشحال زندگی کے مواقع حاصل کر سکتا ہے۔

خداوند عالم سچے مسلمان کو اس قسم کی زندگی مرحمت فرمانے کا وعدہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً﴾ (١٦/ النحل:٩٧)

''جو مرد یا عورت نیک کام میں حصہ لیں اور ان کے اندر ایمان موجود رہے تو ہم انہیں اچھی زندگی عطا کریں گے۔''

---

[1] مسند احمد: ١/ ١٦٨، رقم: ١٤٤٧۔

[2] ترمذی، کتاب الزهد، باب ماجاء فی الکفاف وا لصبر علیه، رقم: ٢٣٤٨۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک اس اچھی زندگی سے مراد یہی ''قناعت والی زندگی'' ہے۔

غریبی اور خیرات

اسلام اس موقف کو ضرور پسند کرتا ہے جس میں سرمایہ داروں کو اس بات کی تلقین کی جاتی ہے کہ وہ عطیہ اور خیرات دینے میں دریغ نہ کریں۔ غریبوں کے دکھ درد میں شریک رہیں اور نیک کاموں میں پیش قدمی کریں، لیکن با ایں ہمہ اسلام شخصی خیرات کو مکمل علاج تصور نہیں کرتا۔ اس لیے کہ ناداروں کو محض سرمایہ داروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا کوئی انصاف نہیں۔ خصوصاً جب کہ سرمایہ دار طبقہ بڑی حد تک خود غرضی، سنگ دلی اور عقیدے کی کمزوری کا شکار ہو، اللہ اور رسول اور ثواب و عذاب کی فکر سے کہیں زیادہ مال و زر کی محبت میں گرفتار ہو اور ان کی ہیئت کذائی بھی زمانۂ جاہلیت کے اس سماج سے مشابہ ہو جس کی قرآن پاک نے ان الفاظ میں مذمت کی ہے:

﴿كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ ۝ وَلَا تَحَاضُّونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ۝ وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا ۝ وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝﴾

(۸۹/ الفجر:۱۷ تا ۲۰)

''ہرگز ایسا نہیں، بلکہ تم اور تمہارے اعمال بھی موجب عذاب ہیں۔ چنانچہ تم لوگ یتیم کی کچھ قدر اور خاطر نہیں کرتے اور دوسروں کو بھی مسکین کو کھانا دینے کی ترغیب نہیں دیتے اور تم میراث کا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور مال سے تم لوگ بہت ہی محبت رکھتے ہو۔''

پھر اس حقیقت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کہ شخصی خیرات سے غریبی ہٹانے میں ناکامی کا حقیقی سبب بھی خیرات کا یہی نظریہ ہے، چنانچہ ڈاکٹر ابراہیم لیبان نے غریبوں کے حقوق پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

''مختلف آسمانی مذاہب نے غریبی کو ہٹانے کے لیے انفرادی خیرات اور غریبوں کی ہر ممکن امداد...... کا طریقہ تجویز کیا۔ ایک عرصے تک عوام کی بھاری اکثریت بھی اس کی

پیروی کرتی رہی، لیکن دشواری یہ رہی کہ یہ تدبیر اپنی جگہ قابل قدر ہونے کے باوجود غربت کی بیخ کنی اور پسماندہ طبقے کو باعزت مقام دلانے میں قطعی ناکام رہی، جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ تجویز اپنے مقصد میں ناکام ہے، لیکن پھر بھی اس نظریے کو رد کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نئے سرے سے اس کا جائزہ لیا جائے اور ناکامی کے حقیقی اسباب تلاش کیے جائیں۔"

ادنیٰ سے غور کے بعد ہر کوئی سمجھ سکتا ہے کہ روزمرہ کے کاموں میں کچھ کام ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں۔ ایک حیثیت سے وہ واجب ہوتے ہیں، لیکن دوسرے پہلو سے انہیں حق کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر خرید و فروخت کو لیجیے! آپ بھی اسے تسلیم کریں گے کہ خریدار کے ذمے قیمت کی ادائیگی واجب ہوتی ہے۔ ایک اس لیے کہ حق دار خود پیہم تقاضا کیا کرتا ہے اور بہر صورت اسے وصول کرنے کے درپے ہوتا ہے۔ دوسرے ملکی قانون بھی اس حق کو حق دار تک پہنچانا لازمی قرار دیتا ہے۔ اب یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ خرید و فروخت کی کامیابی اسی واجب اور حق کے ملے جلے احساس میں مضمر ہے۔ اب اس تمہید کی روشنی میں خیرات کو لیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ خیرات کے بارے میں عام رجحان یہ رہا ہے کہ خیرات کسی کا حق نہیں اور نہ اس قدر اہم ذمہ داری ہے جس کی وصولی ضروری قرار پائے یا اس پر کسی قسم کا جبر کیا جائے۔ البتہ اس کی حیثیت ایک شخصی ذمہ داری کی سی ہے جس کے پورا کرنے میں چنداں مضرت بھی نہیں ہے، لیکن فکر و نظر کی یہی وہ غلطی تھی جس نے خیرات کے نظریے کو نقصان پہنچایا، چنانچہ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ اس نظریے کے عین عروج کے زمانے میں خود غریبوں تک کو یہ احساس نہ ہوا کہ دوسروں کے ذمہ ان کے بھی کچھ حقوق نکلتے ہیں۔ جو انہیں ملنے چاہئیں، پھر اس پر طرہ یہ کہ سرمایہ دار اور خود خیرات کے حق داروں تک کو یہ خیال نہ آتا تھا کہ ان کے معاملے میں حکومت کسی قسم کی مداخلت کرے گی، اس لیے کہ حکومت بھی کسی معاملے میں مداخلت معقول اسباب کے بغیر نہیں کرتی۔

اب رہا شخصی خیرات کا مسئلہ! تو حکومت کے لیے اس میں مداخلت کی ذرّہ برابر

بھی گنجائش نہیں ہے، اس لیے کہ حکومت مخصوص شرطوں کے ساتھ دوسری چیزوں پر ٹیکس کی کوئی رقم تو مقرر کرسکتی ہے، لیکن خیرات کے نام سے کوئی ٹیکس کیونکر عائد ہوسکتا ہے؟ کہ ہر آدمی غریبوں پر اس قدر مہربانی کر دیا کرے۔ مزید برآں یہ تعین کیونکر کیا جاسکتا ہے کہ مہربانی اور خیرات کا یہ کام کون لوگ؟ کس وقت؟ اور کس صورت میں انجام دیا کریں گے؟

مختصر یہ کہ انفرادی خیرات اپنی جگہ بے حد کمزور اور موہوم سا تخیل ہے۔ جس سے غریبی کا علاج یقیناً مشکل ہے اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس نظریے کی رو سے سماج کے اندر غریبوں کے لیے کوئی امداد کی مقدار متعین نہیں کی جاتی، نہ ہی خیرات و مہربانی کرنے کو بنیادی حق کا درجہ دیا جاتا ہے، جس سے اس کے اندر پختگی اور ثبات پیدا ہوتا ہے۔ مزید دشواری اس لیے پیش آئی کہ اس کام کی ذمہ داری فرد کی اپنی صوابدید پر چھوڑ دی گئی اور کسی بھی خارجی طاقت کو غریبوں کی حمایت یا امیروں کے اس نجی معاملے میں مداخلت کا مجاز نہیں ٹھہرایا گیا، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ لوگ خیرات کی مقدار گھٹاتے رہے۔ غریب طبقہ بھی جو پہلے سے ہر قسم کے سماجی تعاون سے محروم تھا، کشاں کشاں فقر و فاقے کے مہیب غار کی طرف بڑھتا رہا اور آخر میں یہ نظریہ بھی پورے طور پر اضمحلال کا شکار ہو کر رہ گیا۔ [1]

اسلام سرمایہ داروں کے نظریے کا مخالف ہے

انفرادی خیرات کی طرح اسلام یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ دولت سرمایہ داروں کی ذاتی ملکیت سمجھی جائے۔ تصرف کے جملہ حقوق بس انہیں حاصل ہوں اور کسی کو خیرات دینا، نہ دینا ان کی اپنی مرضی پر موقوف ہو، اس لیے کہ قارون کی ذہنی اپج یہی تھی جس نے دولت کی نسبت اپنی طرف کرتے ہوئے اللہ کی نعمتوں کا انکار کیا تھا اور اپنی پسماندہ قوم کی حق تلفی کی تھی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ''اللہ نے اس کو اور اس کے دھن دولت کو زمین میں دھنسا دیا اور کوئی اس کا پرسان حال نہ رہا۔ (۲۸/ القصص:۸۱)

اس کے برعکس اسلام دولت کو اللہ کی ملکیت اور اس کا عطیہ قرار دیتے ہوئے بندے کو محض نائب اور نگران کی حیثیت دیتا ہے۔ جس کا کام یہ ہے کہ دولت کو حاصل کرنے

[1] مجمع البحوث الاسلامیہ قاہرہ، ص: ۴۲۔۲۴۳۔

اور خرچ کرنے میں صرف اپنے مولیٰ کی مرضی کو مدنظر رکھے۔ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ أَنفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ ﴾ (۲/ البقرة:۲۵٤)

''جو مال ہم نے تم کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرو۔''

نیز فرمایا:

﴿ وَأَنفِقُوا مِمَّا جَعَلَكُم مُّسْتَخْلَفِينَ فِيهِ ﴾ (۵۷/ الحدید:۷)

''اور جس مال میں تم کو اس نے قائم مقام کیا اس میں سے (اس کی راہ میں خرچ کرو)۔''

مال دار کا مال خود اس کا نہیں، خدا کا عطیہ ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

﴿ وَآتُوهُم مِّن مَّالِ اللَّهِ الَّذِي آتَاكُمْ ﴾ (۲٤/ النور:۳۳)

''اور اللہ کے (دیئے ہوئے) اس مال میں سے ان کو بھی دو جو اللہ نے تم کو دے رکھا ہے۔''

یہ اس لیے کہ انسان زیادہ سے زیادہ عمل پیدائش میں اپنی کوشش صرف کرتا ہے لیکن اس کوشش سے نتیجہ برآمد کرنا اللہ کے سوا کون کرسکتا ہے۔ چنانچہ کھیت میں بیج ڈالنا یقیناً اس کے بس میں ہے، لیکن اس بیج سے پودا اگانا اور پودے کو درخت کی شکل دینا اس کے بس میں نہیں۔

پھر اسلام بتاتا ہے کہ یہی مالک حقیقی جس نے انسان، اس کی دولت اور ساری کائنات کو پیدا کیا، غریبوں کی مشکلات کا احساس دلا کر، مالداروں کو ان کی دولت میں، بلکہ سچ پوچھیے تو اپنی ہی دولت میں، جس کے وہ فقط امین ہوتے ہیں ایک مخصوص مقدار علیحدہ کرنے کا حق دیتا ہے۔

اور یہ حقیقت ہے کہ یہاں محض زبانی حکم پر اکتفا نہیں کیا جاتا۔ نہ ہی خیرات دینے کے حکم کو کافی سمجھا جاتا ہے، اس لیے کہ تنہا یہ چیزیں کسی بھی بگڑے ہوئے ماحول کو بدل نہیں سکتیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی شریعت نے اس معاملے میں مداخلت کرنے اور غریبوں کے حقوق کی بحالی کے لیے اسلامی حکومت کو مکمل اختیارات دیئے اور حکم عدولی

کرنے والوں سے اس وقت تک برسرِ پیکار رہنے کا حکم دیا جب تک وہ ان کی ادائیگی کے لیے تیار نہ ہو جائیں۔

دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلام انتہائی منصفانہ طور پر دو ایسے ذرائع کو یکجا کرنے میں کامیابی حاصل کر لیتا ہے جن میں باہم بڑی دوری ہے۔ چنانچہ ایک طرف وہ دعوت و تبلیغ اور اخلاقی دباؤ کے ذریعے دلوں کو ہموار کرتا ہے اور دوسری طرف پہلی تدبیر کارگر نہ ہونے کی صورت میں جبر و اکراہ اور قانون کی طاقت استعمال کرنے سے بھی قطعاً گریز نہیں کرتا۔ یہ طریق کار ''خیرات سے غریبی کا علاج'' اور سرمایہ داروں کے نقطۂ نظر سے بدرجہ بہتر ہے، اس لیے کہ ہر کوئی جانتا ہے کہ جہاں نرمی سے کام نہیں بنتا وہاں سختی ناگزیر ہوتی ہے۔ قرآنی تعلیمات سے روگردانی کرنے والوں کا بہتر علاج یہ ہو سکتا ہے کہ ان پر تعزیرات کی دفعات نافذ کر دی جائیں۔

پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ غریبی ہٹانے کے لیے سرمایہ داروں کی نام نہاد تجاویز کے مقابلے میں اسلام کا طریق کار چند امتیازی خصوصیات کا حامل ہے:

① اسلام کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے غریبوں کے حقوق سب سے پہلے تسلیم کیے، ان کی ضمانت دی اور گزشتہ چودہ صدیوں سے، اس راہ میں مزاحمت کرنے والوں سے برابر جنگ کر رہا ہے اور مثل مشہور ہے کہ ''پہل کرنے والا افضل ہوتا ہے خواہ بعد والے کتنا ہی آگے کیوں نہ نکل جائیں۔''

② دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ حقوق خالص اسلامی ہیں۔ اسلام ان حقوق کو بنیادی اور آئینی تصور کرتا ہے اور انہیں رکن کا درجہ دیتا ہے۔ کسی ازم یا دوسرے دھرم سے مستعار لے کر اپنے نظام میں ان کی پیوند کاری نہیں کرتا، نہ ان کو ایسی ضمنی حیثیت دیتا ہے جو ماحول، سماج، زمانے کے انقلاب یا جنگی حالات کے دباؤ کا نتیجہ ہو۔

③ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ حقوق دائمی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہیں ان کی حیثیت وقتی اور عارضی نہیں، ورنہ یہ واقعہ ہے کہ جس نظام میں وقتی تقاضوں کے سبب کوئی تبدیلی ہوتی ہے۔ آگے چل کر کسی اور وقتی تقاضے کے تحت مزید تبدیلیوں کا امکان نکل آتا ہے اور یہ

سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس اسلام ازلی شریعت اور اللہ کا ایسا آخری قانون ہے جس میں تا قیامت کسی ترمیم یا تبدیلی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

④ چوتھی اور سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اسلامی نظام خود ایک جامع، ٹھوس اور مکمل نظامِ حیات ہے۔ جس کے اندر وہ ساری خوبیاں اور کمال موجود ہے جو ایک ہمہ داں اور ہمہ بیں ذات کے مقرر کردہ نظام کا طرۂ امتیاز ہے اور یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ کوئی نظام نہ ان اوصاف کا حامل ہے، نہ ان اوصاف میں اسلام کی ہمسری کا تصور کر سکتا ہے۔ چنانچہ یہ مشاہدہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کی جاری کردہ بیشتر اسکیمیں، کڑی شرطوں کے ساتھ انتہائی محدود پیمانے پر کسی ضرورت مند کو مالی تعاون یا امداد دیتی ہیں، لیکن انہیں مطلق اس کی پروا نہیں ہوتی کہ لینے والے کی ضرورت اس امداد سے پوری ہوتی ہے یا نہیں۔

اس اجمال کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ

① یورپ نے طویل غور و فکر کے بعد امداد و اعانت کے لیے ''انشورنس'' اور ''بیمہ'' کے طریقے کو رواج دیا اور چونکہ ان کا موجد یورپ تھا، اس لیے فیشن کی طرح دنیا کے بہت سارے ملکوں میں اس کا شہرہ ہوا، لیکن اس اسکیم کی ایک خامی تو یہ ہے کہ اس کا فائدہ وہی اٹھا سکتا ہے، جو خانہ پری کے بعد خود کو اس اسکیم سے متعلق کر چکا ہو، اسی لیے غیر متعلقہ افراد کو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا، خواہ ان پر کیسی ہی افتاد کیوں نہ پڑے۔

دوسرے یہ کہ اس اسکیم میں پالیسی خریدنے والے کو وہی کچھ ملتا ہے جس قدر برسرِ روزگار رہتے ہوئے گاہے بگاہے وہ جمع کیے ہوئے ہوتا ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ زیادہ آمدنی والے کی بچت زیادہ اور کم آمدنی والے کی بچت کم ہوگی، جبکہ حاجت اور ضرورت کم آمدنی والوں کو زیادہ ہوا کرتی ہے۔

اس کے برعکس اسلامی نظام بنی نوعِ انسانی کی عمومی کفالت کی جو ذمہ داری اپنے اوپر عائد کرتا ہے خصوصاً مسلمانوں کو جس نظام کا پابند بناتا ہے، اس کی ممتاز صفت یہی ہے کہ امدادی رقم پانے والوں کا کوئی سرمایہ پہلے سے بیت المال میں جمع نہیں ہوتا۔ اسی لیے تقسیم کے وقت کم یا زیادہ امداد کے لیے کسی ناپ تول کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی۔ جس سے

ضرورت مند کی جملہ ضرورتیں رفع ہو جاتی ہیں اور وہ فارغ البال اور آسودہ حال ہو جاتا ہے۔

② سماجی کفالت کے یوروپین نظام میں نقص کی یہ دو وجہیں مستزاد ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ جملہ ضرورت مند یکساں طور پر ان سے مستفید نہیں ہو سکتے، دوسرے یہ کہ اسلامی نظام زکوٰۃ کے ذریعے سے جس ہمہ گیر طریقے پر غریبوں کی اعانت اور دستگیری کرتا ہے یوروپین نظام برائے نام امداد پر یقین رکھتا ہے۔ تفصیل آرہی ہے۔

اشتراکیت اور اسلام

اب رہی اشتراکیت (مارکسسٹ کمیونسٹ) جس کی نظر میں غریبی کا علاج بس اس صورت میں ممکن ہے کہ سرمایہ داروں کے خلاف یورش کی جائے، ان کی املاک ضبط کر لی جائے، نجی ملکیت کو سرے سے ختم کر دیا جائے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ پس ماندہ طبقہ میں سرمایہ داروں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکا کر اس قسم کی طبقاتی جنگ کا ماحول پیدا کیا جائے، تا آنکہ محنت کش عوام کی فتح ہو اور پرولتاری آمریت بحال ہو جائے! تو واقعہ یہ ہے کہ اسلام ان رجحانات کی مخالفت کرتا ہے، اس لیے کہ یہ نظریہ براہ راست اسلامی اصولوں سے ٹکراتا ہے۔

اختلافات کی چند وجوہات یہ ہیں:

① یہ درست ہے کہ سرمایہ داروں میں ایک ایسا طبقہ موجود ہے جو دولت کے نشے میں ظلم وزیادتی کا خوگر بنا، یہاں تک کہ ناداروں اور مزدوروں کے جائز حقوق تک دبا بیٹھا، لیکن یہ بھی درست ہے کہ ان ہی میں ایک دوسرا طبقہ ایسا بھی ہمیشہ سے رہا ہے جس نے دولت کو نعمت الٰہی سمجھا اور اس کے حقوق کی ادائیگی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی...... پھر ایسے حالات میں اسلام یہ کیوں کر پسند کرے گا کہ گناہ قوم کے چند افراد ہی کریں لیکن اس کی سزا پوری قوم کو دی جائے!؟

اسلام کا ازل سے یہ دستور ہے کہ ہر کوئی اپنا ہی جواب دہ ہے۔ یا اپنے ان ماتحتوں کا، جن کی نگرانی اسے سونپی گئی ہے، لیکن ان کے علاوہ کسی اور کی جواب دہی اس کے اوپر عائد نہیں ہوتی:

﴿ كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ﴾ (۵۲/ الطور: ۲۱)

''ہر شخص اپنے اعمال (کفریہ) میں محبوس (جہنم میں) رہے گا۔''

﴿ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۚ ﴾

(۶/ الانعام: ۱۶۴)

''اور جو شخص بھی برا عمل کرتا ہے۔ وہ اسی پر رہتا ہے اور کوئی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔''

قرآن پاک بتاتا ہے کہ یہی اصول پچھلی کتابوں میں بعینہٖ موجود تھا:

﴿ اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِىْ صُحُفِ مُوْسٰى ۙ وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِىْ وَفّٰٓى ۙ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۙ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۙ ﴾

(۵۳/ النجم: ۳۶تا۳۹)

''کیا اس کو اس مضمون کی خبر نہیں پہنچی جو موسیٰ کے صحیفوں میں ہے اور نیز ابراہیم کے، جنہوں نے احکام کی پوری بجا آوری کی، (وہ مضمون یہ ہے کہ) کوئی شخص کسی کا گناہ اپنے اوپر نہیں لے سکتا اور یہ کہ انسان کو (ایمان کے بارے میں) صرف اپنی ہی کمائی ملے گی۔''

ان قوانین کو عقل سلیم اور حق وصداقت پر مبنی آئین بھی تسلیم کرتا ہے۔

② اختلاف کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اسلام خاص طور پر انفرادی اور نجی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے۔ اس لیے کہ اس صورت میں انسان کے فطری جذبات کی تسکین ہوتی ہے۔ سماج کے اندر ترقی اور پیش قدمی کی امنگیں پیدا ہوتی ہیں۔ معاش کی نئی نئی راہیں کھلتی ہیں اور درحقیقت شہری اور سیاسی آزادی کی سچی ضمانت اسی کے اندر مضمر ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ اسلام کی دی ہوئی یہ ملکیت آزاد اور بے لگام نہیں۔ چنانچہ اسلام اس کے لیے حدود مقرر کرتا ہے۔ کچھ پابندیاں عائد کرتا ہے، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

اب رہا سوال کہ سماج کا ایک طبقہ اگر ظلم کی حد تک نجی ملکیت کا غلط استعمال کرتا ہے تو بلاشبہ یہ اس کا قصور ہے۔ انفرادی ملکیت کا نظریہ اس سے کسی معنی میں متاثر نہیں

ہوسکتا، اس لیے کہ خرابی اور فساد کا ناسور ان افراد میں ہے نہ کہ اس نظریے میں۔ ورنہ تجربہ شاہد ہے کہ دل اور ضمیر پاک ہو تو وہی دولت خیر و برکت کا سرچشمہ بن جاتی ہے۔

چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

((نِعْمَ الْمَالُ الصَّالِحُ لِلرَّجُلِ الصَّالِحِ)) [1]

''دولت نیک آدمی کا بہترین سرمایہ ہے۔''

یہی وجہ ہے کہ اسلام ضمیر اور نفس کی اصلاح و تربیت پر سب سے زیادہ زور دیتا ہے، پھر قانون کو چوکس اور رائے عامہ کو بیدار رکھتا ہے، تا کہ نفس کو شرارت کا موقعہ نہ ملے۔

③ علاوہ ازیں اسلام افراد اور جماعتوں کے درمیان اخوت اور ایک دوسرے کی مدد کرنے کی اسپرٹ پیدا کرتا ہے، تا کہ عداوت اور طبقاتی کش مکش کی نوبت نہ آئے، اس لیے کہ اس کی نظر میں حسد اور دشمنی خود بہت بڑی آفت ہے جو اعمال کو اس طرح غارت کرتی ہے جیسے آگ سوکھی لکڑی کو جلا کر خاک کر دیتی ہے۔ اس لیے حضور ﷺ نے اسے قومی روگ کا نام دیا ہے، جس سے پوری پوری قومیں تباہ ہو جاتی ہیں۔

اور اگر اس قدر پیش بندیوں کے بعد بھی بدقسمتی سے امت کسی انتشار کا شکار ہوتی ہے تو واقعہ یہ ہے کہ اسلام معاشرے کے ذمہ دار افراد کو فتنہ و شر کے رفع کرنے پر مجبور کرتا ہے اور ایسے نازک وقت میں روزہ، نماز اور صدقہ خیرات جیسی عبادتوں کی ادائیگی کو ثانوی حیثیت دیتا ہے، نیز اس لیے کہ ایمان اور اخوتِ اسلامی کا یہی تقاضا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ ﴾ (٤٩/ الحجرات: ١٠)

''مسلمان آپس میں سب بھائی بھائی ہیں، تو اپنے دو بھائیوں میں صلح کرا دیا کرو۔''

بخاری اور مسلم میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

((كُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا)) [2]

[1] مسند احمد: ٤/ ١٩٧، رقم: ١٧٣٠٩۔ [2] بخاری، کتاب الأدب، باب ما ینھیٰ عن التحاسد والتدابر، رقم: ٦٠٦٤؛ مسلم، کتاب البر والصلہ، باب تحریم التحاسد و التباغض والتدابر، رقم: ٦٥٢٦؛ مسند احمد: ١/ ٧، رقم: ٣٥۔

''بندگانِ خدا! آپس میں بھائی بھائی بن کر رہو۔''

اسلام کی یہ وہ اسپرٹ ہے جو اسلام کو ان تمام مذاہب کے خلاف صف آرا کرتی ہے جن کا بنیادی تخیل زرداروں اور ناداروں میں کینہ وحسد کی آگ بھڑکانا اور اس کو ہوا دینا ہے اور یہ صرف اس لیے کہ بھائی چارہ اور آپس کی صلح وصفائی اسلام کی بنیادی تعلیمات میں سے ہے۔ قرآن حکیم اسی کی دعوت دیتا ہے اور احادیث نبوی اسی کی تائید کرتی ہیں۔

لیکن خدارا! ان تعلیمات کا موازنہ مسلمانوں کے موجودہ طریق زندگی سے ہرگز نہ کیجئے، اگر ان تعلیمات کا صحیح اور سچا نمونہ دیکھنا ہو تو ابتدائے اسلام کے زرین دور کو دیکھئے، جہاں ایک طرف عبدالرحمٰن بن عوف اور عثمان غنی جیسے مال دار صحابہ تھے، جن کے یہاں سیم و زر کی فراوانی تھی، لیکن دوسری طرف ان ہی کے پہلو بہ پہلو ابوہریرہ، ابوذر اور بلال (رضوان اللہ علیہم اجمعین) جیسے مفلس اور نادار صحابہ بھی موجود تھے۔ جن کی تنگ دستی محتاج بیان نہیں، لیکن کیا تاریخ بتا سکتی ہے کہ ان میں باہمی نفرت اور بغض وحسد کسی درجہ موجود تھا یا کوئی سرمایہ دار کسی نادار کو دیکھ کر اکڑتا یا اتراتا تھا؟ نہیں! بلکہ یہ سب اسلامی رواداری اور وسیع النظری سے سرشار اپنے معبود حقیقی کے فرمان کے مطابق آپس میں بھائی چارے کے رشتے سے منسلک تھے۔

④ پھر اسلام یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ ایک مسئلے کے حل کے لیے اس سے سنگین مسائل پیدا کر دیئے جائیں۔ جب کہ دوسری طرف کمیونزم اور اشتراکیت کی تمام تر کوشش یہی ہوتی ہے کہ غریبی اور اقتصادی بدحالی کو دور کرنے کے لیے قومی آزادی کا گلا گھونٹ دیا جائے اور ایسی سفاک اور خود غرض آمریت قائم کر دی جائے جو روزگار اور اناج کے ذخیروں پر پہرے بٹھا دے، آزادانہ نقل وحرکت اور نجی ملکیت کو خواب وخیال بنا دے اور ساری قوم کو ایسے شکنجے میں کس دے جس میں ہر کوئی خود کو غلام محسوس کرے اور صرف ایک فرد کو سربراہی اور بالادستی حاصل رہے، جو پولیس فورس، انٹیلی جنس، حوالات اور خفیہ تہہ خانوں اور اذیت خانوں کے زور پر پورے ملک کو ایک وسیع جیل خانے میں تبدیل کر دے اور عوام اس فورس سے مرعوب ہو کر اپنے اور بال بچوں کی خیر منانے کے لیے چپ سادھ لیں اور طوق غلامی

اپنے گلے میں ڈال لیں اور اس کے سوا وہ کیا کریں گے، بھلا تن تنہا اس کے مقابلے میں چوں چرا کی ہمت ان میں کہاں سے آئے گی؟ جو مختار کل اور ڈکٹیٹر بن کر اقتدار اعلیٰ کو اپنی مٹھی میں لیے ہو اور جو بزبان حال، ان کا اور ان کی اولاد کا ان داتا، خود کو تصور کرتا ہو......

قرآن کریم مجبوری کی اس زندگی کو دور غلامی سے اسی لیے تعبیر کرتا ہے کہ قوتِ ارادی آدمی کے اندر بیداری اور جرأت پیدا کرتی ہے۔ جس کے بعد آدمی صحیح معنی میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو کر دوسروں کی خاطر خواہ نگہداشت بھی کر سکتا ہے اور غلام ان اوصاف سے عاری اور تہی دست ہوتا ہے۔

قرآن پاک کا ارشاد ہے:

﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا ۭ هَلْ يَسْتَوٗنَ ۭ﴾

(١٦/ النحل:٧٥)

''اللہ تعالیٰ ایک مثال بیان فرماتے ہیں کہ ایک غلام ہے مملوک، اسے کسی چیز کا اختیار نہیں اور ایک شخص ہے جس کو ہم نے اپنے پاس سے خوب روزی دی ہے وہ اس سے پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتا ہے کیا (اس قسم کے شخص) آپس میں برابر ہو سکتے ہیں؟''

قرآن پاک کی نظر میں غلام کا تصور یہ ہے کہ وہ بے بس ہوتا ہے۔ ہر قسم کے قبضۂ قدرت اور ملکیت سے خالی ہوتا ہے، رہا آزاد، تو سچ مچ وہ آزاد اور با اختیار ہوتا ہے۔ جو چاہتا ہے کر سکتا ہے۔

قرآن کریم کی نظر میں آزاد و خود مختار وہ ہے:

﴿مَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا ۭ﴾ (١٦/ النحل:٧٥)

''اور ایک شخص ہے جس کو ہم نے اپنے پاس سے خوب روزی دی ہے وہ اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتا ہے۔''

⑤ شخصی آزادی اور نجی ملکیت پر قدغن لگانے کے بعد تحریک کے اس دور میں اشترا کیوں

نے عوامی مفاد، صنعتی اور زراعتی انقلاب اور ملک میں عام اصلاحات کے نام سے بے شمار بلند بانگ دعوے اور اونچے وعدے کیے اور نت نئے عجیب وغریب فارمولے عوام کے سامنے پیش کیے، لیکن سچ پوچھیے تو غریبی ہٹانے اور غریبوں کی مشکلات کو دور کرنے میں انہیں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوسکی، اتنا ضرور ہوا کہ ان کے اوچھے ہتھکنڈوں سے زچ ہوکر سرمایہ داروں نے کہیں ان کے سامنے سپر ڈال دی، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ناداروں کو وہ ان کی جگہ سے بلند نہ کرسکے اور اگر غریبی کو عام کرنا اور غریبوں کے معیار کو پست کر دینا ہی ان کی انتہائی آرزو تھی، تو بے شک کھلے دل سے اس بات کا اعتراف کیا جاسکتا ہے کہ ہمارے کمیونسٹ اور اشتراکی بھائیوں کی آرزو پوری ہوئی اور ان کی محنت ٹھکانے لگی، اس لیے کہ ہر سیاح جو کسی بھی مارکسی ملک کا دورہ کرتا ہے، اسے وہاں معیار زندگی کی پستی، فی کس آمدنی کے تناسب میں بے حد کمی اور زندگی کی حقیقی لذتوں سے ان کی محرومی صاف نظر آتی ہے، جیسا کہ اعداد وشمار کی رپورٹ سے اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

(دفتر اعداد وشمار، یو۔این۔او نے چند سال پہلے اس رپورٹ کو شائع کیا)

ملک	فی کس سالانہ آمدنی	ڈالر	تقریباً	اعداد	پاؤنڈ
ریاستہائے متحدہ امریکہ	۱۴۵۳	"	"	۵۵۰	"
کینیڈا	۸۷۵	"	"	۳۰۰	"
سویزرلینڈ	۷۴۹	"	"	۲۹۰	"
سویڈن	۷۸۰	"	"	۲۶۰	"
برطانیہ	۷۷۳	"	"	۲۵۵	"
ڈنمارک	۶۸۹	"	"	۲۴۰	"
آسٹریلیا	۶۱۹	"	"	۲۳۵	"
بلجیئم	۵۸۲	"	"	۲۱۰	"
ہالینڈ	۵۰۲	"	"	۱۹۰	"
فرانس	۴۸۲	"	"	۱۸۰	"

چیکوسلاویہ	۳۷۱	"	"	۱۴۰	"
روس	۳۰۸	"	"	۱۱۰	"
پولینڈ	۳۰۰	"	"	۱۰۵	"
ہنگری	۲۶۹	"	"	۱۰۰	"
چین	۲۷	"	"	۱۰	"

(النظام الشیوعی)

اور اگر کمیونسٹ ملکوں میں اقتصادی بدحالی کی یہ تاویل کی جائے کہ وہاں کمیونسٹ اصولوں پر کما حقہ، عمل نہ کیا گیا تو یہ بے معنی سی بات ہوگی! اس لیے کہ کوتاہی اور خرابی عملدرآمد میں نہیں، خود ان اصولوں کے اندر موجود ہے۔ ورنہ خود سوچئے کہ جس جگہ ایک ذاتی ملکیت کا خاتمہ کر دیا جائے، وہاں کے افراد میں کام کی لگن اور پیداوار میں اضافے کے لیے جوش و ولولہ کیونکر پیدا ہوگا؟ نیز ایسے افراد کس کام کے ہوں گے، جو خود کے تو مالک ہوں گے، لیکن ان کی روح اور عقل دوسروں کی غلام ہوگی۔

یہ انہیں اسباب کا نتیجہ تھا کہ ان کے یہاں زندگی کے مختلف شعبوں میں عام گراوٹ رونما ہوتی رہی اور خود ان سرمایہ داروں کے مقابلے میں ان کی حالت روز بروز ابتر ہوتی رہی، جنہیں کم از کم مکمل اختیارات اور آزادئ رائے بہر حال حاصل تھی۔

اور بالآخر وہ زمانہ آیا جب کہ اپنی یہ پستی اشتراکیوں کے دل کی خلش بن گئی اور خود ان کی صفوں میں بالا بالا اس پر تنقیدیں ہونے لگیں اور ان کی نگاہیں پھر اس نظام کی طرف اٹھنے لگیں، جس سے کبھی انہوں نے نفرت بھی کی تھی!

⑥ غرض مارکسسٹ اصولوں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ سماج کے اندر موجود اپاہجوں، بیواؤں اور ناداروں کے لیے ان کے یہاں کوئی گنجائش نہیں۔ انہیں بس گرے پڑے کچھ ٹکڑے ہی مل سکتے ہیں جو بڑی جھڑکیوں اور ڈانٹ ڈپٹ کے بعد ان کے ہاتھ لگتے ہیں۔ ہاں ان کی تمام تر توجہ ''پرولتاری گروپ'' یعنی محنت کش مزدوروں اور کسانوں پر مبذول ہوتی ہے، جنہیں وہ سماج میں سنسنی پھیلانے اور سیاسی توڑ جوڑ کے لیے استعمال کرتے ہیں

پھر ان مزدوروں کو بھی مزدوری کی مقررہ اجرت ملتی ہے۔ اس لیے کہ ان کا فلسفہ یہ ہے کہ

''جو کما نہ سکے، اسے کھانے کا کوئی حق نہیں ہے۔''

ڈانٹ پھٹکار اور جھڑکیاں ان کا مقدر ہے، یا روٹی کے گرے پڑے کچھ ٹکڑے۔ [1]

نصیبِ تنگی جامۂ تار تار ے!

خلاصہ

ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ اسلام غریبی کو ایک ایسا مسئلہ سمجھتا ہے جس کا حل ممکن ہے، ساتھ ہی خود اس کے امکانی علاج کی نشاندہی کرتے ہوئے اس بات سے آگاہ کرتا ہے کہ غریبی کے خلاف جنگ کسی صورت میں مشیت الٰہی اور تقدیر سے جنگ کرنے کے مترادف نہیں، لیکن بایں ہمہ اسلام اسے پسند نہیں کرتا کہ غریبی کو نعمت الٰہی اور دولت کو گناہوں کی فوری سزا تصور کیا جائے۔

☆ ...... اسلام اسے بھی پسند نہیں کرتا کہ غریبی کو تقدیر کا اٹل فیصلہ سمجھ کر اس کے آگے سپر ڈالنے کی تلقین کی جائے، یا اس کے ازالہ کی تدبیر سوچنے کی بجائے اس پر خوشیاں منائی جائیں!

☆ ...... اسلام اس عقیدے کو بھی درست نہیں خیال کرتا کہ غریبی کے علاج کو شخصی خیرات میں مضمر مانا جائے۔

☆ ...... اسی طرح غریبوں سے متعلق سرمایہ داروں اور حکومت کے اس رویے کی اسلام مخالفت کرتا ہے، جس کی نمائندگی آزاد سرمایہ دارانہ نظام کرتا ہے، جب کہ ان ہی میں خود کو اعتدال پسند سمجھنے والے لوگ بھی موجود ہیں جو پیوند کاری اور شگاف کو سلائی سے بند کرنے کی ناکام کوششوں میں سرگرداں ہیں۔

☆ اسلام ان افراد کو بھی پوری شدت سے نظر انداز کرتا ہے جو سرمایہ دار سے برسر

---

[1] واضح رہے کہ مارکسسٹ کیونسٹوں کا مذہب کے بارے میں کیا عقیدہ ہے، دین ومذہب کا وہ کس طرح انکار کرتے ہیں، کفر والحاد پر مبنی باطل عقائد کو بنیاد بنا کر ہر اصلاحی تحریک کو کس طرح مذاق اور تنقید کا نشانہ بناتے ہیں؟ یہ اور اس قبیل کے دیگر امور سر دست ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ اسی لیے ہم نے ان کے صرف ان نظریات کو درج کیا ہے، جن کا تعلق غریبی اور اس کے علاج سے ہے اور یہی اس کتاب کا موضوع ہے۔

پیکار ہیں۔ اگر چہ اس خلفشار کو وہ قانونی جنگ کا نام نہ دیتے ہوں، اس لیے کہ جن کے خلاف یہ صف آرا ہیں، ان میں سبھی لوٹ کھسوٹ اور حق تلفی کے مجرم نہیں ہوتے، بلکہ بہت سے ایسے ہوتے ہیں جو حلال اور گاڑھی کمائی سے دولت مند بنتے ہیں اور اس کے حقوق کا لحاظ کرتے ہیں۔

☆ اسلام ان تمام انتہا پسند جانبدار نظریوں کو ٹھکراتا ہے، جو سیدھی راہ سے بہت دور، افراط یا تفریط میں مبتلا ہیں۔

ان پیچ دار بھول بھلیوں سے ہٹ کر اسلام کچھ مثبت علاج تجویز کرتا ہے۔ چند تعمیری اور قابل استعمال وسائل کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ جن کی تفصیل ہم آیندہ پیش کر رہے ہیں۔

باب سوم

اسلامی ذرائع... پہلا ذریعہ

☆...... حرکت وعمل

☆...... محنت سے گریز

☆...... حکایت

☆...... توکل کا غلط مفہوم

☆...... رہبانیت اور اسلام

☆...... مختلف معاشی وسائل حدیث کی روشنی میں

☆...... تجارت۔ زراعت۔ دستکاری

☆...... کسی کام میں شرم نہیں

☆...... تلاشِ معاش

☆...... بھیک اور گداگری

☆...... گداگروں کے ہتھکنڈے

☆...... فراہمیِ روزگار

☆...... خلاصہ

اسلامی ذرائع

اس میں شک نہیں کہ اسلام غریبی کی مذمت اور ہر محاذ پر اس کے خلاف جنگ اس لیے کرتا ہے، تاکہ عقائد اور رہن سہن کے طریقوں میں بگاڑ نہ آئے، خاندان اور سماج کی حفاظت ہو اور خاص طور پر ایسے سماج کی تعمیر ہو سکے جس میں ہر فرد اخوت اور مساوات کے مخلصانہ جذبات سے سرشار ہو اور یہ ہر کوئی جانتا ہے کہ یہ تب ہوگا جبکہ لوگوں کے پاس کھانے پینے اور رہنے سہنے کے لئے، اسی طرح دیگر ضروریات زندگی کی تکمیل کے لیے اس قدر اسباب فراہم ہوں، جو ان کے اور ان کے بال بچوں کے لیے بڑی حد تک کافی ہوں، اور ان کی انفرادی، اجتماعی یا ازدواجی زندگی کسی کدورت اور میل کے بغیر اپنے رب کی خوشنودی حاصل کرنے اور اس سے تعلق استوار کرنے میں بسر ہو اور اگر خیر سے کسی مسلم معاشرے یا اسلامی ملک میں کوئی غیر مسلم، امان لے کر سکونت پذیر ہو تو رہائش اور ہمہ قسم کی آسائش کے اسباب اس کے لیے بھی فراہم ہوں اور اپنے بال بچوں کے ساتھ اس کی گزران بھی راحت و آرام سے ہو سکے، لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوگا کہ اسلام کے وہ ذرائع کیا ہیں اور اسلامی معاشرے میں رہنے والے افراد کو یہ چیزیں کیونکر میسر آ سکتی ہیں۔

پہلا ذریعہ......حرکت و عمل

بطور جواب آئندہ سطروں میں انہیں ذرائع اور وسائل کو سلسلہ وار پیش کیا جاتا ہے۔ اسلام معاشرے کے ہر شخص سے مطالبہ کرتا ہے کہ جب قدرت کا اتنا بڑا کارخانہ صرف اس کے لیے حرکت و عمل میں مصروف ہے تو اس کا بھی یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ خود بھی اپنے ہاتھ پیر کو حرکت دے، محنت سے گریز نہ کرے اور قرب و جوار میں چل پھر کر اپنی روزی خود تلاش کرے۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ﴾ (٦٧/ الملك:١٥)

''وہ ایسا منعم ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو مسخر کیا، سو تم اس کے راستوں میں چلو پھرو اور اللہ کی روزی میں سے (جو زمین میں پیدا کی ہے) کھاؤ پیو۔''

عمل سے مراد وہ مناسب روزگار ہے، جس سے اپنے اور اپنے خاندان...... کے لیے خاطر خواہ روزی کا سامان ہو سکے۔

اس میں شک نہیں کہ زندگی کے جہاد میں محنت ومشقت اور حرکت وعمل وہ حربہ ہے جس کے ذریعہ انسان دولت پیدا کر سکتا ہے۔ زمین کے اس ویرانے کو آباد کر سکتا ہے اور غریبی اور ناداری کے خلاف فیصلہ کن جنگ کر سکتا ہے۔

حضرت صالح علیہ السلام کی زبان سے قرآن پاک کا ارشاد ہے:

﴿يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا﴾ (۱۱/ هود:٦١)

''اے میری قوم! تم اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں اس نے تم کو زمین کے مادے سے پیدا کیا اور اس نے تم کو اس میں آباد کیا۔''

(الف) علاوہ ازیں اسلامی سوسائٹی کی ایک ممتاز خوبی یہ ہے کہ وہ ہر شخص کو اس بات کی پوری آزادی دیتی ہے کہ پیدائش دولت کے لیے جس پیشے کو چاہے اختیار کرے، خواہ ادنیٰ ہی پیشہ کیوں نہ ہو، لیکن کسی کو ایسے کام کے لیے مجبور نہیں کیا جاتا جو اس کی فطرت کے خلاف یا اس کے معاشرے کے لیے ضرر رساں ہو۔

اسلام میں حرام ٹھہرائے گئے کاموں کی علت عموماً یہی ہوتی ہے۔

(ب) لیکن معاً ہذا اسلام اس کی بھی تائید کرتا ہے کہ حرکت وعمل سے روزگار اور روزگار سے روزی اور تن آسانی کی فراہمی ایک امر بدیہی ہے، لیکن یہ خواب اس وقت شرمندہ تعبیر ہو گا، جب سماج، ملک اور ملکی سیاست پر اسلام اور اسلامی تہذیب وہدایات کی چھاپ نمایاں ہو گی۔

چنانچہ کارکردگی اور محنت کے معیار کو بلند کرنے اور مالک و مزدور کے درمیان رونما ہونے والے مسائل کے تصفیہ کے لیے اسلام نے جو اخلاقی ضابطے مقرر کیے ہیں ان کے پیش نظر یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ایک محنت کش مزدور بھی ہر قسم کے جھگڑوں اور پریشانیوں سے یکسو ہو کر محض اپنی مزدوری کے سہارے اپنے بال بچوں کا پیٹ پال سکتا ہے اور دوسرے رشتے داروں کے حقوق بھی ادا کر سکتا ہے۔ اس لیے کہ اسلام سکھاتا ہے کہ پسینہ خشک ہونے سے پہلے مزدور کی محنت کا ثمرہ بلا کم و کاست اس کے ہاتھوں میں پہنچا دیا جائے۔

اسلام کی نظر میں ایسے لوگ بدترین ظالم ہوتے ہیں، جو طے شدہ اجرت سے کمی کرتے ہیں یا سرے سے اس کی ادائیگی کی کوئی فکر نہیں کرتے اور یہ طے ہے کہ اسلام مظالم کو سخت ترین حرام سمجھتا ہے۔

اسلام سکھاتا ہے کہ مال و دولت اللہ کا فضل ہے، جسے حاصل کرنے کے لیے ہر جائز کوشش درست ہے اور ہر مسلمان کو اس سلسلے میں مکمل مذہبی آزادی حاصل ہے۔ اسلام اس کی کھلی اجازت دیتا ہے کہ آدمی اپنی پس انداز کردہ دولت سے کسی بھی قسم کی منقولہ یا غیر منقولہ جائیداد کی خرید و فروخت کرے۔

محنت سے گریز

اسلام اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ آدمی کیڑے مکوڑوں کی طرح زندگی نہ گزارتے ہوئے ایسے وسائل اختیار کرے جن سے اس کا معیار زندگی بلند ہو۔ اس کی بیماری اور کبرسنی کے دن سکھ چین سے بسر ہوں اور اس کے بعد اس کے بچے دربدر کی ٹھوکریں نہ کھاتے پھریں۔

اسی لیے اسلام نے بہت پہلے سے ان فاسد اوہام اور باطل خیالات کی جڑیں کاٹ دیں جن کے ہوتے ہوئے آدمی محنتی اور جفاکش بننے کی بجائے کاہل اور سست بن جاتا ہے۔

(الف) چنانچہ کچھ لوگوں کو یہ وہم ہو جاتا ہے کہ انہیں خدا پر بھروسہ ہے۔ اس نے پیدا

کیا ہے تو روزی بھی وہی دے گا۔ خواہ اس کے لیے محنت مشقت کی جائے یا نہ کی جائے۔ اسلام اس قماش کے لوگوں کو ناسمجھ تصور کرتا ہے۔ اس لیے کہ توکل اور خدا پر بھروسہ کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ آدمی محنت کرنے اور اسباب کو استعمال کرنے سے گریز کرے اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ رہے بلکہ مسلمانوں کا شیوہ ہے کہ وہ اسباب کو کام میں لائیں گے۔ چنانچہ کھیتی کرنی ہو تو پہلے زمین درست کریں گے، پھر بیج ڈالیں گے۔ البتہ نتیجہ خدا پر چھوڑ دیں گے۔

زمانۂ نبوی ﷺ کا واقعہ ہے کہ جب ایک بدوی نے اپنی اونٹنی مسجد نبوی کے دروازے پر کھلی چھوڑ دی اور اپنی دانست کے مطابق خدا پر توکل کرنا چاہا تو حضور اکرم ﷺ نے انہیں فہمائش کی اور فرمایا کہ:

((اِعْقِلْهَا وَتَوَكَّلْ)) [1] ''(دیکھو!) اسے باندھ لو، پھر خدا پر بھروسہ کرو۔''

حکایت

اسی مفہوم کی ایک حکایت ہمیں صوفیا کے یہاں ملتی ہے، کہتے ہیں کہ

حضرت شقیق بلخی رحمۃ اللہ علیہ تاجر پیشہ تھے۔ ایک بار تجارت کی غرض سے سفر پر نکلنے سے پہلے اپنے دوست حضرت ابراہیم ادہم رحمۃ اللہ علیہ سے ملنے گئے، اس لیے کہ ان کا خیال تھا کہ ممکن ہے سفر میں مہینوں لگیں پھر نہ جانے کب ملاقات ہو؟ لیکن توقع کے خلاف چند ہی دن گزرے تھے کہ شقیق سفر سے واپس آ گئے، اگلے روز ابراہیم ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے جب انہیں مسجد میں حاضر دیکھا تو حیرت سے کہا: کیوں شقیق! اتنی جلدی لوٹ آئے؟ شقیق نے جواب دیا، جناب! کیا عرض کروں، راستے میں، میں نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا اور وہیں سے الٹے پیر لوٹ آیا! ہوا یہ کہ میں نے نسبتاً ایک غیر آباد جگہ تکان دور کرنے کے لیے پڑاؤ ڈالا۔ وہیں میں نے ایک پرندے کو دیکھا، جو آنکھ اور قوت پرواز سے یکسر محروم تھا، مجھے خیال آیا بھلا ایسی دور افتادہ جگہ اس بے چارے کی گزر بسر کیسے ہوتی ہوگی؟ ابھی میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ میں نے ایک دوسرے پرندے کو دیکھا اس کی چونچ میں کوئی چیز دبی

[1] ترمذی، کتاب صفة القيامه، باب حديث إعقلها وتوكل، رقم: ٢٥١٧۔

ہوئی تھی، اس نے آتے ہی وہ چیز پرندے کے آگے ڈال دی اور چلا گیا، اس طرح اس نے پھیرے کئے اور بالآخر پہلے پرندے کا پیٹ بھر گیا، میں نے سوچا سبحان اللہ! خدا جب ایسی دور افتادہ جگہ رزق پہنچا سکتا ہے تو اس طرح شہر در شہر بھٹکنے کی مجھے کیا ضرورت ہے؟ چنانچہ میں مزید آگے سفر جاری رکھنے سے باز آیا، اور گھر کی راہ لی۔

یہ سن کر ابراہیم ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے کہا، شقیق تمہارے اس طرح سوچنے سے سخت مایوسی ہوئی، آخر اس اپاہج پرندے کی طرح بننا تم نے کیوں پسند کیا جس کی زندگی دوسروں کے ٹکڑوں پر کٹ رہی ہو؟ تم نے یہ کیوں نہیں چاہا کہ تمہاری مثال اس پرندے کی سی ہو جو اپنا پیٹ بھی پالتا ہے اور دوسروں کا پیٹ پالنے کے لیے بھی کوشاں رہتا ہے۔ کیا تم بھول گئے کہ اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بدرجہا بہتر ہوتا ہے؟ شقیق نے یہ سنا تو بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھے، ابراہیم ادہم کا ہاتھ چوما...... اور کہا ابو اسحاق! تم نے میری آنکھیں کھول دیں، اور پھر اگلے دن سے انہوں نے دوبارہ تجارت شروع کر دی۔

توکل کا غلط مفہوم

(ا) کچھ لوگ محنت مشقت اور کام کاج سے بچنے کے لیے اس حدیث کا سہارا لیتے ہیں جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَوْ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَوَكَّلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ حَقَّ تَوَكُّلِهِ لَرُزِقْتُمْ كَمَا تُرْزَقُ الطَّيْرُ تَغْدُوْ خِمَاصًا وَتَرُوْحُ بِطَانًا)) [1]

”اگر تم اللہ پر بھروسہ کرو تو پرندوں کی طرح وہ تمہیں روزی عطا کرے گا۔ تم پرندوں کو دیکھتے ہو کہ صبح خالی پیٹ گھونسلوں سے نکلتے ہیں، لیکن شام کو آسودہ ہو کر واپس آتے ہیں۔“

ان لوگوں کی دانست میں حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خدا پر توکل کیا جائے، تو روزی خود بخود مل جاتی ہے۔ حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ یہی حدیث خود ان کے مفروضے کو غلط

[1] ترمذی، کتاب الزھد، باب فی التوکل علی اللہ، رقم: ٢٣٤٤؛ مسند احمد: ١/ ٣٠، رقم: ٢٠٥؛ ابن ماجہ، کتاب الزھد، باب التوکل والیقین، رقم: ٤١٦٤۔

ثابت کرتی ہے اور حصولِ رزق کے لیے جدو جہد کرنے کی صاف طور پر دعوت دیتی ہے، اس لیے کہ یہ حدیث بتاتی ہے کہ پرندوں کا شکم سیر واپس آنا اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ رزق کی تلاش میں وہ نکل کھڑے ہوتے ہیں اور دن بھر اسی فکر میں سرگرداں رہتے ہیں۔ گویا پرندوں کی دادودہش ان کے لیے حصول رزق کا سبب ہے۔ اس تمثیل کی رو سے صحابہ کرام خشکی اور تری کا تجارتی سفر فرماتے تھے یا پھر کھجوروں کے باغات اور نخلستانوں میں مصروف عمل رہا کرتے تھے۔ ان صحابہ کی پیروی ہمارے لیے بس ہے۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا، ایک شخص اس خیال سے گھر یا مسجد میں نشست جمائے ہے کہ مجھے کچھ کرنے کی چنداں حاجت نہیں، میرا رزق مجھے مل کر رہے گا۔ اس شخص کے بارے میں کیا رائے ہے؟

آپ نے فرمایا: یہ شخص پرلے درجے کا جاہل ہے۔ اسے نہیں معلوم کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((جُعِلَ رِزْقِي تَحْتَ ظِلِّ رُمْحِي)) [1]

"اللہ نے میرے رزق کو میرے نیزے کے نیچے چھپا رکھا ہے۔"

درحقیقت باری تعالیٰ نے زمین کو بنایا تو اس میں خیر اور برکتوں کو ودیعت فرمایا اور انسانوں اور تمام جانداروں کے لیے روزی اور زندگی کی جملہ ضروریات اس کے اندر مہیا فرمائیں۔ چنانچہ ارشاد ہے:

﴿وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴾ (۷/ الاعراف: ۱۰)

"اور بے شک ہم نے تم کو زمین پر رہنے کو جگہ دی اور ہم نے تمہارے لیے اس میں سامانِ زندگانی پیدا کیا۔ تم لوگ بہت ہی کم شکر کرتے ہو۔"

بنی آدم پر اپنے احسانات کا اظہار فرماتے ہوئے دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ

[1] بخاری، کتاب الجهاد، باب ما قيل في الرماح، رقم الباب: ۸۸، ذکر البخاری فی الترجمۃ مسند احمد: ۲/ ۵۰، رقم: ۵۰۹٤۔

الطَّيِّبٰتِ﴾ (۱۷/ الاسرآء:۷۰)

''اور ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی اور ہم نے ان کو خشکی اور دریا میں سوار کیا اور نفیس نفیس چیزیں ان کو عطا فرمائیں۔''

نیز فرمایا:

﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۭ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ښ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (۴۰/ الغافر:٦٤)

''اللہ ہی ہے جس نے زمین کو (مخلوق کا) قرارگاہ بنایا، سو عمدہ نقشہ بنایا اور تم کو عمدہ عمدہ چیزیں کھانے کو دیں۔ پس اللہ ہے تمہارا رب، سو بڑا عالی شان ہے اللہ جو سارے جہاں کا پروردگار ہے۔''

یہی نہیں، باری تعالیٰ نے زمین پر بسنے، اور تا قیامت اس کی پشت پر چلنے والے جملہ جانداروں کی روزی رسانی کی ذمہ داری اپنے اوپر لے رکھی ہے۔ چنانچہ اس کا ارشاد ہے:

﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا﴾ (۱۱/ ھود:٦)

''اور کوئی رزق کھانے والا جانور روئے زمین پر چلنے والا ایسا نہیں کہ اس کی روزی اللہ کے ذمہ نہ ہو۔''

بے شک زمین کی بیکراں پہنائی، سمندروں کی تہیں، اور آفاق کی وسعتیں، رزق کے خزانوں اور روزی کے ذخیروں سے بھری پڑی ہیں، لیکن قانونِ قدرت یہ ٹھہرا کہ جس روزی کو اس نے ہر سو بکھیر دیا، جس کی بندوں تک بہم رسانی کا اس نے ذمہ لیا اور جس کی تلاش وجستجو کے تمام راستے اس نے آسان فرمائے۔ بندہ اس کی طلب اور حصول کے لیے کمر بستہ ہو اور اس کے لیے محنت ومشقت اختیار کرے۔ اسی لیے باری تعالیٰ نے حصولِ رزق اور اس کے لیے تگ ودو کو لازم وملزوم قرار دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ۭ﴾ (٦٧/ الملك:١٥)

''سوتم اس کے رستوں میں چلو اور اللہ کی روزی میں سے کھاؤ پیو۔''

معلوم ہوا کہ تگ و دو کرنے والا شکم سیر ہوگا اور جو صلاحیت و استعداد رکھتے ہوئے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہوگا، حرماں نصیبی اس کا مقدر ہوگا۔

سورۂ جمعہ میں اسی مفہوم کو قدرے واضح طور پر پیش کیا گیا۔ چنانچہ ارشاد ہے:

﴿فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾ (٦٢/ الجمعة:١٠)

''پھر جب نماز جمعہ پوری ہو چکے تو (اس وقت) تم زمین پر چلو پھرو اور اللہ کا فضل (یعنی روزی) تلاش کرو۔''

یعنی جو کوئی فضل الٰہی کی تلاش اور معاش کے حصول میں سرگرم اور متحرک ہوگا، گوہر مراد سے ہمکنار ہوگا، لیکن جس نے غفلت برتی اور کنارہ کش رہا وہ سخت محروم ہوگا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کا یہ واقعہ تاریخ کی کتابوں میں درج ہے کہ نماز کے بعد کچھ لوگ مسجد کے ایک گوشے میں اس خیال سے بیٹھ رہے کہ حصول رزق کے لیے انہوں نے ابھی ابھی جو دعا کی ہے۔ اس کے صلے میں خدا ان کی روزی وہیں پہنچا دے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب انہیں دیکھا اور ان کی سرگزشت سنی تو اپنا کوڑا تان کر فرمایا: ''اس طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے کیوں بیٹھے ہو؟ جب کہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ آسمان سے نہ کبھی سونا برسا ہے اور نہ چاندی! کیا خداوند عالم نے نہیں فرمایا؟

﴿فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾ (٦٢/ الجمعة:١٠)

''پھر جب نماز جمعہ پوری ہو چکے تو، (اس وقت) تم کو اجازت ہے کہ تم زمین پر چلو پھرو اور خدا کی روزی تلاش کرو۔''

اس میں شک نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسی کوڑے میں قانون کی حکمرانی اور اس کی کامیابی کا راز مضمر ہے۔ اس لیے کہ نرمی سے بات نہ سمجھنے والے سختی کے بعد ہی راہ راست پر آتے ہیں۔

رہبانیت اور اسلام

(ب) کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ پورے طور پر اللہ کی عبادت اور بندگی کے لیے گوشہ نشینی اختیار کر لینی چاہیے۔ چنانچہ اس رجحان کے تحت وہ ہر قسم کے کام کاج سے الگ ہو کر تارک الدنیا فقیروں اور سادھو سنیاسیوں کی طرح دنیا ہی سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس آیت کا مفہوم بھی یہی ہے:

﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴾ (۵۱/ الذاریات:۵۶)

''اور میں نے جن اور انسانوں کو اسی واسطے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کیا کریں''

ایسے لوگوں کو حضور اکرم ﷺ نے واضح طور پر تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:

((لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ)) ''اسلام کسی طرح کی رہبانیت کا قائل نہیں۔'' [1]

اس کے برعکس اسلام کی نظر میں ہر وہ کام عبادت میں شمار ہوتا ہے جو اخلاص اور للّٰہیت کے جذبے کے ساتھ کیا جائے، اسی طرح اگر کوئی حرام سے دامن بچانے کے لیے یا اپنے اہل وعیال کی کفالت یا رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے حقوق کی ادائیگی کے لیے فکر معاش میں سرگرداں رہے تو اسے خدا کی راہ میں جہاد تصور کیا جاتا ہے۔

اسی لیے باری تعالیٰ نے فکر معاش کی تگ ودو اور اللہ کی راہ میں جہاد کو اس آیت میں ایک ساتھ ذکر فرمایا:

﴿ وَآخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْأَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَآخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ (۷۳/ المزمل:۲۰)

''اور بعضے تلاش معاش کے لیے ملک میں سفر کریں، اور بعضے اللہ کی راہ میں جہاد کریں۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مشہور مقولہ ہے۔ آپ نے فرمایا:

''خدا کی راہ میں لڑتے ہوئے جان دینے کی خواہش کے بعد جس دوسری موت

[1] مسند احمد: ٦/ ٢٢٦، رقم: ٢٥٣٦٥۔

کی میں تمنا کرتا ہوں، وہ یہ ہے کہ حصول رزق اور فارغ البالی کی تلاش میں میری موت واقع ہو۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿ وَاٰخَرُوْنَ یَضْرِبُوْنَ ﴾ (۷۳/ المزمل:۲۰) [سنن سعید بن منصور]

مختلف معاشی وسائل حدیث کی روشنی میں

مال و دولت حاصل کرنے کے بہترین ذرائع تجارت، زراعت اور صنعت و حرفت وغیرہ ہیں۔

ذیل کی حدیثوں کا مطالعہ کرتے ہوئے غور کیجئے کہ حضور ﷺ نے ان کاموں کی ترغیب کس طرح دلائی ہے۔

تجارت

تجارت کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا:

((اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِیْنُ مَعَ النَّبِیِّیْنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَاءِ)) [1]

”سچے تاجر کا حشر انبیاو صدیقین اور شہدا و صالحین کے ساتھ ہوگا“

زراعت

زراعت اور کاشتکاری کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا:

((مَامِنْ مُسْلِمٍ یَغْرِسُ غَرْسًا اَوْیَزْرَعُ زَرْعًا فَیَأْکُلُ مِنْهُ طَیْرٌ اَوْاِنْسَانٌ اَوْبَھِیْمَةٌ اِلَّا کَانَ لَهٗ بِهٖ صَدَقَةٌ)) [2]

”جب مسلمان کاشتکاری کرتا ہے یا کوئی پودا لگاتا ہے اور پھر اس سے کوئی

---

[1] ترمذی، کتاب البیوع، باب ماجاء فی التجار و تسمیة النبی ﷺ ایاھم، رقم: ۱۲۰۹؛ ابن ماجه، کتاب التجارات، باب الحث علی المکاسب، رقم: ۲۱۳۹۔

[2] بخاری، کتاب الحرث والمزارعة، باب فضل الزرع والغرس إذا أکل منه، رقم: ۲۳۲۰؛ مسلم، کتاب المساقاة، باب فضل الغرس والزرع، رقم: ۳۹۶۹؛ ترمذی، کتاب الأحکام، باب فی فضل الغرس، رقم: ۱۳۸۲؛ مسند احمد: ۳/ ۱۴۷، رقم: ۱۳۰۷۶۔

پرندہ، چوپایہ یا انسان مستفید ہوتا ہے تو اس کی طرف سے یہ عمل صدقہ تصور کیا جاتا ہے۔"

دستکاری

دستکاری اور صنعت و حرفت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا:

((مَا أَكَلَ أَحَدٌ طَعَامًا قَطُّ خَيْرًا مِّنْ اَنْ يَّأْكُلَ مِنْ عَمَلِ يَدِهِ)) [1]

"کسی آدمی نے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے زیادہ لذیذ کھانا نہیں کھایا ہوگا"

((مَنْ اَمْسٰى كَالًّا مِنْ عَمَلِ يَدَيْهِ اَمْسٰى مَغْفُوْرًا لَّهٗ)) [2]

"جو شخص کام کرتے کرتے شام کردے اور تھک جائے۔ اللہ اسے معاف فرمائے گا۔"

نیز یہ بھی فرمایا:

((مَنْ بَاتَ كَالًّا مِنْ طَلَبِ الْحَلَالِ بَاتَ مَغْفُوْرًا لَّهٗ)) [3]

"جو شخص رزق حلال کے لیے سرگرداں رہے اور اسی فکر میں پڑھ کر سو رہے، اللہ اسے معاف فرمائے گا۔"

مشہور تابعی امام ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا، امانت دار تاجر اور عبادت گزار صوفی میں آپ کس کو ترجیح دیں گے۔ آپ نے فرمایا، امانت دار تاجر، میری نظر میں افضل ہے۔ اس لیے کہ شیطان ہر صورت میں اسے ورغلاتا ہے، کبھی ناپ تول اور کبھی لین دین میں اسے الجھاتا ہے، لیکن یہ اسے شکست پر شکست دیتا جاتا ہے۔ ایک نامور صوفی اور بزرگ شیخ شعرانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے ملفوظات میں کاری گروں کو عبادت گزاروں پر فوقیت دیتے تھے اور اس کی وجہ یہ بتاتے تھے کہ عبادت کرنے سے صرف عابد کو نفع پہنچتا ہے، جب کہ صنعت و حرفت سے بہت سوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ کتنا اچھا ہو کہ درزی اپنی سوئی کو اور بڑھئی اپنی آری کو تسبیح کا دانہ قرار دے۔ یعنی یہ لوگ کام بھی کرتے رہیں اور

[1] بخاري، كتاب البيوع، باب كسب الرجل و عمله بيده، رقم: ٢٠٧٢۔

[2] معجم الطبراني الأوسط، ج٨، ص: ٢٥٧، رقم: ٧٥١٦۔

[3] تهذيب تاريخ دمشق الكبير لابن عساكر، جلد٤، ص: ٢٨٤۔

ساتھ ساتھ یادِ الٰہی میں بھی مصروف رہیں۔

کسی کام میں شرم نہیں

(ج) کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں، جو پیشوں کے بارے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ فلاں کام ان کی شان کے خلاف ہے۔ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بھوک اور افلاس سے تنگ آ کر در بدر بھیک مانگنا گوارا کر لیتے ہیں، لیکن کام کرنا پسند نہیں کرتے۔

اسلام سے پہلے عربوں میں کام نہ کرنے اور کام کو حقیر سمجھنے کی ذہنیت عام تھی۔ چنانچہ عرب شاعر اپنے حریف کی ہجو کرتے ہوئے پوری شدت سے اس بات کو اچھالتا تھا کہ اس کا مقابل فلاں لوہار کا بیٹا اور فلاں لوہار کا پوتا ہے، لیکن اسلام نے آ کر دنیا والوں کو اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ روزی حاصل کرنے کے لیے اگر چھوٹے سے چھوٹا پیشہ اختیار کرنا پڑے تو اسے شرم نہیں محسوس کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ یہ تو ہوسکتا ہے کہ پیشہ ور اچھے ہوں یا برے ہوں لیکن کوئی پیشہ خواہ کتنا ہی حقیر کیوں نہ سمجھا جائے۔ اگر اس سے رزق حلال حاصل ہوتا ہے تو وہ برا نہیں ہوسکتا۔

حضور ﷺ نے مختلف موقعوں پر فرمایا:

((لَأَنْ يَّأْخُذَ أَحَدُكُمْ حَبْلَهُ فَيَأْتِيَ بِحُزْمَةِ حَطَبٍ عَلَى ظَهْرِهِ فَيَبِيْعَهَا فَيَكُفَّ اللّٰهُ بِهَا وَجْهَهُ خَيْرٌ لَّهُ مِنْ اَنْ يَّسْأَلَ النَّاسَ أَعْطَوْهُ أَوْ مَنَعُوْهُ.)) [1]

''اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے! اگر تم میں سے کوئی رسی لے کر جنگل جائے لکڑی کاٹے اور اسے اپنی پیٹھ پر لاد کر بازار میں فروخت کر دے تو یہ اس کے لیے در بدر ٹھوکریں کھانے سے بہتر ہے، جبکہ بھیک بھی کبھی ملتی ہے، کبھی نہیں ملتی۔''

---

[1] بخاری، کتاب الزکاة، باب الاستعفاف عن المسألة، رقم: ۱۴۷۱؛ ترمذی، کتاب الزکاة، باب ماجاء في النهي عن المسألة، رقم: ۶۸۰؛ نسائی، کتاب الزکاة، باب الاستعفاف عن المسألة، رقم: ۲۵۹۰۔

اس حدیث کی روشنی میں پیغمبر علیہ السلام نے یہ دکھانا چاہا کہ ہر چند کہ جنگل سے لکڑیاں لانے میں مشقت ہوتی ہے، رسوائی اور حقارت کا سامنا ہوتا ہے اور اجرت بھی کم ملتی ہے، لیکن اس کے باوجود بیکار رہنے اور لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کرنے سے ایسا حقیر کام انجام دینا بہتر ہے۔

پیشے کی آزادی کا ذکر کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے عملی طور پر اپنی اور دیگر انبیا کی مثال دیتے ہوئے فرمایا:

((مَا بَعَثَ اللّٰهُ نَبِيًّا إِلَّا وَرَعَى الْغَنَمَ قَالُوْا: وَأَنْتَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: نَعَمْ كُنْتُ أَرْعَاهَا عَلَى قَرَارِيْطَ لِأَهْلِ مَكَّةَ)) [1]

”اللہ کے ہر نبی نے بکریاں چرائی ہیں۔ صحابہ نے عرض کیا، اللہ کے رسول! کیا آپ نے بھی بکریاں چرائی ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا، ہاں میں بھی معمولی اجرت پر مکہ والوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔“

نیز فرمایا:

((مَا أَكَلَ أَحَدٌ طَعَامًا قَطُّ خَيْرًا مِنْ عَمَلِ يَدَيْهِ وَإِنَّ نَبِيَّ اللّٰهِ دَاوُدَ كَانَ يَأْكُلُ مِنْ عَمَلِ يَدَيْهِ)) [2]

”کسی آدمی نے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے زیادہ لذیذ کھانا نہ کھایا ہوگا۔ اللہ کے نبی حضرت داوٗد علیہ السلام اپنے ہاتھوں سے کام کر کے کھاتے تھے۔“

حاکم نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ

”حضرت داوٗد علیہ السلام زرہ ساز تھے، (یعنی زرہیں بنایا کرتے تھے) حضرت آدم، حضرت نوح، حضرت ادریس، حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام بالترتیب کاشت کاری، بڑھئی، درزی اور بکریاں چرانے کا

---

[1] بخاری، کتاب الاجارات، باب رعی الغنم علی قراریط، رقم: ۲۲۶۲؛ مسلم، کتاب الایمان، باب معرفة طریق الرؤیة، رقم ٤٥٤؛ مسند احمد: ۳/ ۳۲٦، رقم ١٤٠٨٨؛ بخاری، کتاب الانبیاء، باب یعکفون علی اصنام لھم، رقم: ۳٤٠٦۔

[2] بخاری، کتاب البیوع، باب کسب الرجل و عمله بیده، رقم: ۲۰۷۲۔

کام کرتے تھے۔'' (حاکم)

انبیا علیہم السلام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اسی سنت متوارثہ کا نتیجہ تھا کہ بعد میں آنے والے بہت سارے ائمہ عظام اور اکابر علما جن کی زندگی پر ضخیم کتابیں بھی لکھی گئیں اور خود ان کی علمی، ادبی اور دینی تصانیف انہیں زندۂ جاوید کر گئیں، ان میں بڑی تعداد ایسے افراد کی تھی، جو اپنے آباء و اجداد یا کنبے اور قبیلوں کی طرف منسوب نہیں ہوئے بلکہ ان پیشوں اور ذرائع کی طرف ان کی نسبت ہوئی جن سے ان کی گزر بسر ہوا کرتی تھی۔

لیکن اسلامی تہذیب نے اپنے ان فرزندوں کے انتساب پر کبھی بھی کسی قسم کی ذلت یا کمتری کا احساس نہیں کیا، چنانچہ آج بھی ہم ان کے ناموں کے ساتھ بزاز (بساطی) قفال (قفل ساز) زجاج (شیشہ گر) خراز (موچی) جصاص (چونہ فروش) قطان (روئی فروش) خواص (کھجور کے پتے بیچنے والا) خیّاط (درزی) حدّاد (آہنگر) صبّان (صابن ساز) جیسی عرفیت اور نسبت موجود پاتے ہیں۔

تلاش معاش

(د) کچھ لوگ کام نہ کرنے کا یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ انہیں گھر بار، دوست احباب سے قریب رہتے ہوئے کام نہیں ملتا اور وطن سے دور، در بدر مارے مارے پھرنے سے انہیں سخت وحشت ہوتی ہے۔ اس لیے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ پردیس جا کر ٹھوکریں کھانے کی بجائے اپنے گھر میں روکھی پھیکی کھا کر سو رہنا ان کے لیے بہتر ہے۔

اسلام اس قماش کے لوگوں کو خبردار کرتا ہے کہ وہ اس قسم کی کچی باتیں دل سے نکال دیں اور روزی کی تلاش میں نئے نئے میدانوں کی تلاش میں نکل پڑیں۔ اس لیے کہ اللہ کی زمین بڑی کشادہ ہے اور اس کا رزق بے پایاں ہے۔

جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: یہ انسان کی بلند ہمتی کا صلہ ہے کہ جب کوئی شخص روزی کی تلاش میں پردیس جاتا ہے اور وہاں اس کا آخری وقت آ جاتا ہے تو اللہ اس کے وطن سے اس کی جائے وفات تک کے فاصلے کے برابر جگہ اس کو جنت میں عطا فرماتا ہے۔

ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

((سَافِرُوْا تَسْتَغْنُوْا))(طبرانی، منذری) ”سفر کرو بے نیازی پاؤ گے۔“

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ﴾

(٤/ النسآء:١٠٠)

”اور جو شخص اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا تو اس کو روئے زمین پر جانے کی بہت جگہ ملے گی اور بہت گنجائش۔“

﴿ وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ﴾

(٧٣/ المزمل:٢٠)

”اور بعض اللہ کے فضل (یعنی معاش) کی تلاش میں ملک میں سفر کریں گے۔“

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ

”مدینہ منورہ کے رہنے والے ایک شخص کا انتقال ہوا، حضور اکرم ﷺ نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی، نماز سے فراغت کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: ”کاش اپنے وطن سے دور پردیس میں کہیں اس کی موت آتی۔“ کسی نے پوچھا، یارسول اللہ! آخر کس لیے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اس لیے کہ کوئی پردیس جاتا ہے اور وہیں اس کا آخری وقت آجاتا ہے تو باری تعالیٰ جنت میں اسے اتنی ہی زمین عطا فرماتے ہیں، جو اس کے وطن سے اس کی جائے پیدائش تک ہوتی ہے۔“

بیرون ملک کا سفر اور پردیس سدھارنے کی اس قدر حوصلہ افزائی غالباً انسانی برادری کو کسی مذہب سے نہ ہوئی ہوگی، کتاب وسنت کے ان نصوص کی بنا پر صحابہ کرام تن بتقدیر نکل پڑے اور اللہ کی راہ میں جہاد اور علم ورزق کے حصول کے لیے اطراف میں پھیل گئے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا ایک اولوالعزم خاتون تھیں۔ آپ کے متعدد لڑکے تھے، لیکن وہ تادیر یکجا نہ رہ سکے، کوئی کہیں جابسا، کوئی کہیں آباد ہوا اور وہیں پیوند خاک ہوا۔ ان فرزندوں سے متعلق ایک سوال کے جواب میں اس عظیم ماں نے کہا تھا: ”ان کے عزم وحوصلے نے

انہیں ہار کے بکھرے ہوئے دانوں کی طرح پھیلا دیا۔"

بھیک اور گداگری

(۵) کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو زکوٰۃ اور خیرات جمع کرنے کو پیشہ بنا لیتے ہیں اور پھر انہیں مانگنے کی اس قدر لت پڑ جاتی ہے کہ وہ نہ کوئی کام کرنا پسند کرتے ہیں اور نہ مانگنے میں کسی قسم کی شرم و حیا محسوس کرتے ہیں، حالانکہ یہ سب جسم کے اچھے اور ہاتھ پاؤں کے تندرست ہوتے ہیں اور کمانے کی پوری صلاحیت ان کے اندر موجود ہوتی ہے۔

حقیقت میں یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو لوگوں کے سامنے اپنی غریبی کا جھوٹا رونا روتے ہیں۔ چاپلوسی، جی حضور اور خوشامد کا سہارا لے کر مالداروں کے گرد منڈلاتے ہیں۔ بھیک کے ٹکڑوں پر گزارہ کرتے ہیں، لیکن محنت کی روٹی توڑنا گوارا نہیں کرتے۔

ان لوگوں کے متعلق اسلام کا فیصلہ ہے کہ وہ جب تک تندرست ہیں، کمانے کی سکت رکھتے ہیں، انہیں زکوٰۃ اور خیرات لینے کا کوئی حق نہیں، پھر ان احادیث کی روشنی میں غور کیجئے کہ ناحق زکوٰۃ و خیرات اور بھیک مانگنے والوں کا انجام کیا ہوگا۔ چنانچہ ارشاد ہے: ((لَا تَحِلُّ الصَّدَقَةُ)) "کسی غنی یا تندرست و توانا کے لیے صدقہ جائز نہیں۔" [1] ایک مرتبہ دو آدمی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور زکوٰۃ کے فنڈ سے کچھ رقم بطور امداد طلب کی، آپ ﷺ نے فرمایا:

((لَا حَظَّ فِيهَا لِغَنِيٍّ وَ لَا لِقَوِيٍّ مُكْتَسِبٍ)) [2]

"وہ شخص زکوٰۃ کا مستحق نہیں جو طاقت ور ہو اور کمانے کی صلاحیت رکھتا ہو یا یہ کہ اس کے پاس سرمایہ ہو۔"

---

[1] دارمی، کتاب الزکاۃ، باب من تحل له الصدقة، رقم: ۱۶۳۹؛ ابن ماجه، کتاب الزکاۃ، باب من سأل عن ظهر غِنًى، رقم: ۱۸۳۹؛ ترمذی، کتاب الزکاۃ، باب ماجاء لا تحل له الصدقة، رقم ۶۵۲۔

[2] ابوداود، کتاب الزکاۃ، باب من یعطی من الصدقة وحدّ الغنی، رقم: ۱۶۳۳؛ نسائی، کتاب الزکاۃ، باب مسألة القوی المکتسب، رقم: ۲۵۹۹؛ مسند احمد: ۵/ ۳۶۲، رقم: ۲۲۵۵٤۔

یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ نے کام سے جی چرانے اور سستی اور کاہلی کرنے والوں کو صدقہ وخیرات سے ہمیشہ دور رکھا، تاکہ یہ اپنی حیثیت کے مطابق کسی روزگار سے لگے رہیں۔ (مزید تفصیل زکوٰۃ کی بحث میں ملاحظہ ہو)

بخاری شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَسْأَلُ النَّاسَ حَتَّى يَأْتِيَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَ لَيْسَ فِيْ وَجْهِهِ مُزْعَةُ لَحْمٍ)) [1]

"تم میں جو کوئی بھیک مانگتا ہے۔ وہ جب خدا کے سامنے جائے گا تو اس کے چہرے پر گوشت کی ایک بوٹی بھی نہ رہے گی۔"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ سَأَلَ النَّاسَ أَمْوَالَهُمْ تَكَثُّرًا فَإِنَّمَا يَسْأَلُ جَمْرًا فَلْيَسْتَقِلَّ أَوْلِيَسْتَكْثِرْ)) [2]

"جس نے پائی پائی جوڑنے کے لیے لوگوں سے سوال کیا، درحقیقت وہ روپیہ کا نہیں، آگ کا سوال کرتا ہے۔ اب یہ اس کا کام ہے کہ آگ کے اس ڈھیر کو وہ چاہے کم کرے یا زیادہ کرے۔"

پائی پائی جوڑنے کا مطلب یہی ہے کہ آدمی بلا ضرورت محض حرص اور لالچ کے تحت بھیک مانگے، صحیحین میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ نے منبر پر صدقہ کرنے اور مانگنے اور نہ مانگنے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

((اَلْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ الْيَدِ السُّفْلٰى)) [3]

---

[1] بخاری، کتاب الزکاۃ، باب من سأل الناس تکثراً، رقم: ۱۴۷٤؛ مسلم، کتاب الزکاۃ، باب کراھیة المسألة للناس، رقم: ۲۳۹٦؛ نسائی، کتاب الزکاۃ، باب المسألة، رقم: ۲۵۸٦؛ مسند احمد: ۲/ ۱۵، رقم: ٤٦۲٤۔ [2] مسلم، کتاب الزکاۃ، باب کراھة المسألة للناس، رقم: ۲۳۹۹؛ مسند احمد: ۲/ ۲۳۱، رقم: ۷۱۲۳؛ ابن ماجه، کتاب الزکاۃ، باب من سأل الناس عن ظهر غنی، رقم: ۱۸۳۸۔ [3] بخاری، کتاب الوصایا، باب تاویل قوله تعالیٰ من بعد وصیة یوصی بها اودین، رقم: ۲۷۵۰؛ مسلم، کتاب الزکاۃ، باب بیان أنَّ الید العلیا خیر من الید السفلیٰ، رقم۲۳۸۵؛ ابوداود، کتاب الزکاۃ، باب فی الاستعفاف، رقم: ۱٦٤۸؛ ترمذی، کتاب الزھد، باب فی فضل الاکتفاء بالکفاف وبذل الفضل، رقم: ۲۳٤۳۔

''اوپر والا ہاتھ (دینے والا) نیچے والے ہاتھ (لینے والے) سے بہتر ہوتا ہے۔''

((لَأَنْ يَغْدُوَ أَحَدُكُمْ فَيَحْتَطِبَ عَلَى ظَهْرِهِ فَيَتَصَدَّقَ مِنْهُ وَيَسْتَغْنِيَ عَنِ النَّاسِ خَيْرٌ لَهُ مِنْ أَنْ يَسْأَلَ رَجُلًا أَعْطَاهُ أَوْ مَنَعَهُ ذَلِكَ فَإِنَّ الْيَدَ الْعُلْيَا ......)) [1]

''بھیک سے بچنے کے لیے یا خیرات کرنے کے لیے تم میں سے کوئی اگر جنگل سے لکڑیاں اپنی پیٹھ پر لائے تو یہ مانگنے سے بہتر ہے، اس لیے کہ بھیک بھی کبھی ملتی ہے، کبھی نہیں اور پھر اوپر والا ......۔''

((مَنْ سَأَلَ مَسْأَلَةً وَهُوَ عَنْهَا غَنِيٌّ كَانَتْ شَيْنًا فِي وَجْهِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ)) [2]

''جس نے بلا ضرورت سوال کیا، اس کا اثر قیامت کے روز اس کے چہرے پر ہوگا۔''

((لَا يَفْتَحُ عَبْدٌ بَابَ مَسْئَلَةٍ إِلَّا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْهِ بَابَ فَقْرٍ)) [3]

''جس نے بھیک مانگنے کا راستہ اختیار کیا اللہ اس کے لیے غریبی اور افلاس کا دروازہ کھول دیتا ہے۔''

أَنَّ رَجُلًا أَتَى النَّبِيَّ ﷺ فَسَأَلَهُ فَأَعْطَاهُ فَلَمَّا وَضَعَ رِجْلَهُ عَلَى أُسْكُفَّةِ الْبَابِ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَوْ تَعْلَمُونَ مَا فِي الْمَسْئَلَةِ مَا مَشَى أَحَدٌ إِلَى أَحَدٍ يَسْأَلُهُ شَيْئًا)) [4]

ایک شخص نے آپ کے پاس آ کر سوال کیا، آپ نے اسے مرحمت فرمایا، پھر جب اس نے گھر کی دہلیز پر قدم رکھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''مانگنے

---

[1] بخاری، کتاب الزکاۃ، باب فی الاستعفاف عن المسألة، رقم: ۱۴۷۰؛ ترمذی، کتاب الزکاۃ، باب فی النہی عن المسألة، رقم: ۶۸۰؛ نسائی، کتاب الزکاۃ، باب الاستعفاف عن المسئلة، رقم: ۲۵۹۰؛ مسند احمد: ۲/ ۲۴۳، رقم: ۷۲۷۵۔

[2] مسند احمد: عن ثوبان ۵/ ۲۸۱، رقم: ۲۱۹۱۴۔ [3] مسند احمد: ۴/ ۲۳۱، رقم: ۱۷۵۷۰؛ ترمذی، ابواب الزهد، باب ما جاء مثل الدنيا مثل اربعة نفر، رقم ۲۳۲۵۔

[4] نسائی، کتاب الزکاۃ، باب الصدقة علی الأقارب، رقم: ۲۵۸۷۔

کی خرابی لوگ جان لیں تو کسی کے دروازے پر جانے کی ہرگز ہمت نہ کریں۔''

((اَلْمَسَائِلُ كُدُوْحٌ يَكْدَحُ بِهَا الرَّجُلُ وَجْهَهُ فَمَنْ شَاءَ أَبْقٰى عَلٰى وَجْهِهِ وَمَنْ شَاءَ تَرَكَ إِلَّا أَنْ يَسْأَلَ الرَّجُلُ ذَا سُلْطَانٍ أَوْفِي أَمْرٍ لَا يَجِدُمِنْهُ بُدًّا)) [1]

''سوال کرنا خراش کے ہم معنی ہے جو کوئی سوال کرتا ہے۔ وہ اپنا چہرہ نوچتا ہے، لہٰذا جو چاہے اسے باقی رکھے یا چاہے ترک کردے، البتہ یہ صورت مستثنیٰ ہے کہ کسی صاحب اقتدار سے مانگے، یا سخت مجبوری کے تحت مانگے۔''

معلوم ہوا کہ بھیک مانگنے سے چہرے کی رونق چلی جاتی ہے، البتہ ذیل کی صورتیں مستثنیٰ ہیں:

① ایک یہ کہ بوقت ضرورت حاکم وقت سے سوال کیا جائے، جو اسلامی شریعت کی رو سے اس امر کے لیے بھی مامور ہوتا ہے۔

② دوسرے یہ کہ سخت اور از حد مجبوری کی حالت میں کسی سے بھی سوال کیا جائے جو اس کی ضرورت پوری کرنے پر قادر ہو، لیکن یہ یاد رہے کہ مجبوری کی حالت میں اجازت بھی بقدر ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے ضرورت سے زیادہ سوال کرنا غلط ہوگا۔

دراصل اس قدر پیش بندی اور احتیاط کی وجہ یہ ہے جیسا کہ علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

''لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا خدا کے ساتھ، اس کے بندوں کے ساتھ اور خود اپنے ساتھ زیادتی اور ناانصافی کرنا ہے۔''

① خدا کے ساتھ ناانصافی اس طرح ہوگی کہ سائل غیر اللہ سے مدد کا طالب ہوگا۔ غیروں کے سامنے اپنی بے چارگی اور غربت ظاہر کرے گا اور خدا کی ذات سے اس کا اعتماد ہٹ جائے گا۔

---

[1] مسند احمد:٥/ ١٩، رقم: ١٩٧٠٧؛ ترمذی، ابواب الزکاۃ، باب فی النھی عن المسئلة، رقم: ٦٨١؛ ابوداود، کتاب الزکاۃ، باب ما تجوز فیه المسئلة، رقم: ١٦٣٩؛ نسائی، کتاب الزکاۃ، باب مسألة الرجل ذاسلطانٍ، رقم: ٢٦٠٠۔

② بندوں کے ساتھ ناانصافی اس طرح ہوگی کہ دینے کی صورت میں وہ زیر بار ہوں گے اور نہ دینے کی صورت میں ہدف ملامت بنیں گے یا خود شرمندہ اور نادم ہوں گے۔ (ناحق مانگنے کا حکم یہ ہے، البتہ حقوق طلب کرنا اس سے مستثنیٰ ہے)

③ خود اپنے ساتھ ناانصافی اس طرح ہوگی کہ سائل اپنے جیسی مخلوق کے سامنے اپنی خودی کو مجروح کرے گا، صبر وشکیب، خدا پر توکل اور بندوں سے بے نیازی کو ایک طرف ڈال کر لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کو بطور پیشہ اختیار کرے گا۔'' [1]

مسلم حکام کی (اگر خوش قسمتی سے کہیں ان کا وجود ہو) ایک اہم ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ بے روزگاروں کو بے یار ومددگار نہ چھوڑیں۔ تندرست اور کمانے کے لائق افراد کی نگرانی کریں اور خاص طور پر ایسے لوگوں پر کڑی نظر رکھیں، جو گداگری کو پیشہ اور زکوٰۃ کو اپنا حق سمجھ بیٹھے ہیں۔ جو لوگوں کا مہمان بننا پسند کرتے ہوں، جبکہ زکوٰۃ لینا ان کے لیے حرام اور لوگوں سے سوال کرنا حد درجہ قابل نفرت ہو۔

پھر اگر حاکم وقت ضرورت محسوس کریں تو اس قسم کے لوگوں کو قرار واقعی سزا بھی دے سکتے ہیں۔ اس لیے کہ شریعت کا مسلمہ قاعدہ ہے کہ جس غلطی کی سزا شریعت میں مقرر نہ ہو۔ حاکم وقت اپنے طور پر اس کی مناسب سزا تجویز کر سکتا ہے۔

گداگروں کے ہتھکنڈے

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ گداگری اور بھیک مانگنے کی مختلف عجیب وغریب صورتیں ہیں بلکہ بعض لوگ جو اس کے عادی ہو چکے ہیں یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بھی ایک پیشہ ہے۔ اس سلسلے میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''احیاء العلوم'' میں چند انتہائی ٹھوس حقائق پیش کیے ہیں۔ چنانچہ معاشی ذرائع اور صنعت وحرفت کی مختلف صورتوں کا جائزہ لینے کے بعد امام صاحب موصوف لکھتے ہیں:

''بعض پیشے ایسے ہوتے ہیں جنہیں قدرے مشقت اور مناسب تربیت کے بعد ہر کوئی اختیار کر سکتا ہے، لیکن یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ کچھ لوگ بچپن

[1] مدارج السالکین از علامہ ابن القیم، ج ۱، ص: ۲۳۲، ۲۳۳۔

کی لاپرواہی کی وجہ سے محنت کرنے کے عادی نہیں بنتے ، یا کسی وجہ سے وہ عادی نہیں بن پاتے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کام سے ناواقف ہونے کا بہانہ بنا کر یہ لوگ کام کرنے سے دستبردار ہو جاتے ہیں اور دوسروں کے ٹکڑوں پر گزارہ کرنا پسند کر لیتے ہیں اور جب یہ نوبت آ جاتی ہے تو گداگری اور اٹھائی گیری جیسے دو گھٹیا قسم کے پیشے وجود میں آتے ہیں اور ہم جو اُن کی کڑی کام سے جی چرانے سے ملاتے ہیں تو اسی لیے کہ محنت نہ کرنا اور دوسرے کی کمائی میں حصہ لگانا، اٹھائی گیری اور گداگری میں مشترکہ طور پر پایا جاتا ہے!

پھر جس وقت عوام اٹھائی گیروں سے چوکنا ہو کر اپنے گھر بار کی نگرانی شروع کرتے ہیں تو یہ لوگ بھی مجبوراً پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے اپنے دماغ پر زور دے کر نئے نئے ہتھکنڈے اور نت نئی چالیں سوچتے ہیں۔ چنانچہ جن کا ذہن چوری کی طرف مائل ہوتا ہے۔ وہ ٹولیاں اور ٹکڑیاں بنا کر پہلے کچھ طاقت حاصل کرتے ہیں اور پھر ایک زبردست گینگ کی شکل اختیار کر لینے کے بعد ڈکیتی اور رہزنی کے لیے نکل کھڑے ہوتے ہیں اور جو ذرا ڈرپوک ہوتے ہیں۔ وہ پس پردہ سازشوں اور ہاتھ کی صفائی میں لگ جاتے ہیں اور نقب زنی، گرہ کٹی یا عیاری و مکاری کے کسی راستے کو اپنا کر روپیہ اینٹھنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں، لیکن جو چوری کو برا سمجھتے ہیں، مگر محنت بھی نہیں کرنا چاہتے، ایسے لوگ جب دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں اور یہ طعنے سنتے ہیں کہ...... جاؤ محنت کرو، جیسے دوسرے کما کر کھاتے ہیں، تم بھی کماؤ کھاؤ، اس طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے کیا حاصل، پھر تمہیں تو یوں ہاتھ بھی نہیں پھیلانا چاہیے...... اس قسم کی تیز و تند باتیں جب ان کے کانوں میں پڑتی ہیں، تب لوگوں کی مٹھی

سے روپیہ نکالنے کے لیے یہ لاکھ جتن کرتے ہیں اور اپنی مسکینی محتاجی اور لاچاری کو ثابت کرنے کے لیے طرح طرح کے ڈھونگ رچاتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ان کی بعض حرکتیں اس قدر اوچھی ہوتی ہیں جو حقیقت میں انہیں قابل رحم بنا دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر کچھ تو سچ مچ اندھے بن جاتے ہیں، یا کسی اندھے کے سرپرست بن بیٹھتے ہیں اور نہیں تو کسی فالج زدہ، پاگل، اپاہج، یا بیکار کا روپ دھار لیتے ہیں، یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ایسا کرنے میں انہیں خود زحمت اٹھانی پڑتی ہے، مگر یہ نادان اس کی مطلق پروا نہیں کرتے، ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو کچھ من گھڑت باتیں اور مضحکہ خیز کرتب سیکھ لیتے ہیں، تاکہ لوگ ان کے فریب میں آ جائیں اور وارفتگی اور بے خیالی میں کچھ سکے جیب سے نکل کر اس کے ہاتھ لگ جائیں، خواہ بعد میں انہیں اپنی نادانی پر افسوس کیوں نہ ہو۔ پھر عام طور سے یہ لوگ سچے جھوٹے قصے، مقفّٰی عبارتیں اور جوشیلی نظموں کا سہارا لیتے ہیں۔ جنہیں اچھی آواز سے دلنشین انداز میں سناتے ہیں، ان کی تاثیر اس وقت سوا ہو جاتی ہے جب ان میں مذہب کی آمیزش یا حسن وعشق کا سوز و گداز شامل ہو جاتا ہے۔ کچھ لوگ ساز و آواز کا سہارا لیتے ہیں اور چنگ ورباب سے لوگوں کو مسحور کرتے ہیں۔

ان پڑھ اور سیدھے سادے لوگوں کو جھانسہ دے کر روپیہ اینٹھنے کا کام وہ لوگ بھی کرتے ہیں جو گنڈے، تعویذ اور جھاڑ پھونک سے بیماریوں اور آسیب کے علاج کا دعویٰ کرتے ہیں، انہیں کے نقش قدم پر نجومی، جیوتشی اور فال کھولنے والے چلتے ہیں۔ اسی زمرہ میں وہ چرب زبان واعظین بھی آتے ہیں جو عوام کی نادانی اور اپنی ہوشیاری کی وجہ سے منبروں تک پہنچ جاتے ہیں ان میں علمی قابلیت برائے نام ہوتی ہے، لیکن عوام کو رام

کرنے اوران کی جیبیں خالی کرنے میں یہ بڑے ماہر ہوتے ہیں۔ یہی
وجہ ہے کہ ان کے نشانے بہت کم خطا کرتے ہیں۔
قصہ کوتاہ! روپیہ اینٹھنے کے ان طریقوں کو شمار کیا جائے تو ان کی تعداد
سینکڑوں سے اوپر ہی نکلے گی۔ [1]

حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ دوررس نگاہیں تھیں جس نے چوری اور گداگری کی مختلف شکلوں میں گہرا ربط تلاش کیا اور ان گنت شکلوں کا سراغ لگایا پھر جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے چوری اور گداگری میں یہی ہوتا ہے کہ آدمی محنت اور مشقت کی بجائے ایسی ایسی شیطانی حرکتیں کرتا ہے جس کی نہ ضمیر اجازت دیتا ہے، نہ مذہب اسے پسند کرتا ہے۔ امام صاحب موصوف نے دوران تحریر گداگری کی چند ایسی مخفی صورتوں کو بھی اجاگر کیا جس سے سماجی بیماریوں پر ان کی گہری نظر کا ثبوت ملتا ہے۔ چنانچہ یہ انہیں کی بالغ نظری تھی کہ انہوں نے علم وبصیرت سے خالی مگر دل نشین وعظ گوئی کو گداگری کی ایک صنف قرار دیا۔ جب کہ عام لوگوں کے ذہن پر ان کی طرف سے حسن ظن کا دبیز پردہ پڑا ہوا ہے!

فراہمیٔ روزگار

(و) کچھ لوگ کام کی اہلیت رکھتے ہوئے بھی اس لیے کام نہیں کرتے کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر وہ کون سا کام کریں؟ جو ان کے لیے مناسب ہو۔ دراصل یہ لوگ کوتاہ اندیش ہونے کے ساتھ باعزت زندگی گزارنے کے جملہ اصولوں سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ ان کے لیے یہ کام بڑا آسان ہوتا ہے کہ خود سے کوئی کام نہ کریں، لیکن محکمۂ روزگار (Department of Employment) یا کسی متعلقہ افسر کے سامنے دھرنا دے کر بیٹھ جائیں اور اس سے روزگار فراہم کرنے کا جھوٹا مطالبہ کریں۔

سیرت طیبہ کے سرسری مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سردار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو روزگار کی فراہمی کے عملی طریقے بھی بتائے تھے اور بے روزگاروں کو روزگار پر بھی لگایا تھا۔

[1] احیاء علوم الدین فی بیان حقیقۃ الدنیا فی نفسها وأشغالها التی استغرقت همم الخلق حتی أنستهم أنفسهم، ج۳، ص: ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳۔

مشہور واقعہ ہے کہ ایک بے روزگار انصاری نے خدمت اقدس میں حاضر ہو کر سوال کیا! آپ نے دریافت کیا، کیا تمہارے گھر میں کچھ ہے؟ انہوں نے عرض کیا، حضور ایک کمبل ہے، اسی کو آدھا بچھا لیتے ہیں اور باقی کو یونہی اوپر ڈال لیتے ہیں اور ایک پیالہ ہے جس میں پانی پیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: ''اچھا دونوں چیزیں لے آؤ۔'' چنانچہ وہ لے آئے۔ آپ ﷺ نے انہیں دست مبارک میں اٹھایا اور نیلام کرنا شروع کیا، ایک صاحب نے ایک درہم (تقریباً ۷ روپے) دام لگایا، آپ نے فرمایا: ''کیا اس سے زیادہ کوئی دینے والا ہے؟'' دوسرے صحابی نے دو درہم قیمت لگائی، آپ نے انہیں کے حوالے کر دیا اور درہم انصاری کو دے کر فرمایا: ''دیکھو ایک درہم کا کھانا خرید کر گھر پہنچا دو اور دوسرے درہم کی کلہاڑی خرید کر میری پاس لے آؤ۔'' جب وہ کلہاڑی لے آئے تو خدا کے اس محبوب بندے نے اپنے دست مبارک سے اس میں ایک لکڑی جوڑ دی اور فرمایا: ''جاؤ جنگل جا کر لکڑی کاٹو اور بازار میں فروخت کرو اور میں چاہتا ہوں کہ پندرہ دن تمہیں نہ دیکھوں (یعنی اس اثنا میں پوری تندہی سے تم محنت کرو)۔'' چنانچہ وہ صاحب گئے اور معمول بنالیا کہ صبح جنگل سے لکڑیاں لاتے اور شام کو بازار میں فروخت کرتے۔ ہوتے ہوتے ان کے پاس دس درہم جمع ہو گئے۔ اب انہوں نے اپنی ضرورت کے مطابق کچھ کپڑے اور کھانے پینے کی چیزیں خریدیں اور ٹھیک پندرہویں روز حاضر خدمت ہو کر اپنی سرگزشت سنائی۔ آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا: ''یہ اس سے کہیں بہتر ہے کہ تم کسی کے سامنے بھیک مانگو اور قیامت کے دن ذلت اٹھاؤ۔ سوال کرنا بس تین حالتوں میں درست ہے، سخت افلاس یا قرض میں یا خون ناحق کے تاوان میں۔'' [1]

یہ روشن اور مرصع حدیث...... بتاتی ہے کہ یہ بھی ممکن تھا کہ حضور ﷺ زکوٰۃ وغیرہ کی مدد سے یا کسی صحابی سے ان کو دو درہم دلوا دیتے، لیکن آپ کی جو غرض تھی، وہ اس شکل میں پوری نہ ہوتی۔ پھر یہ کوئی علاج نہ ہوتا، بلکہ اس کی بیماری بڑھ جاتی اور وہ مانگ مانگ کر پیٹ پالنے کا عادی بن جاتا۔ دراصل آپ یہ چاہتے تھے کہ جہاں تک ہو سکے، ہر

[1] ابن ماجه، ابواب التجارات، باب بيع المزايدة، رقم: ٢١٩٨۔

شخص اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرے۔ ہر مشکل کو حل کرنے کے لیے سب سے پہلے اپنے پاس موجود وسائل کو کام میں لائے، خواہ ان وسائل کی حیثیت معمولی کیوں نہ ہو۔ اسی طرح محض ناکامی کے اندیشے سے کسی تدبیر کو بروئے کار لانے میں پس وپیش بھی نہ کرے اور نہ یہ سوچے کہ لوگ کیا کہیں گے؟ آپ ﷺ نے انہیں تعلیم دی کہ جس پیشے سے حلال روزی حاصل ہو سکے وہ باعزت پیشہ کہلائے گا۔ خواہ وہ جنگل سے لکڑیاں لانا اور بازار میں بیچنا ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے کہ اس سے اتنا تو ہوگا کہ آدمی لوگوں کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے سے بچ جائے گا۔

غرض اللہ کے رسول ﷺ نے کوئی وقتی علاج نہیں کیا، اصل مسئلہ سے چشم پوشی نہیں کی اور نہ صرف نصیحت کرنے یا ڈانٹ ڈپٹ پر اکتفا کیا...... بلکہ آپ نے ان سب سے ہٹ کر اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے خود اس شخص کو تیار کیا اور اشتراک وتعاون اور معاش کی ایسی مثال قائم کی جس سے انسانیت پہلی بار روشناس ہوئی۔

روزگار کی طرف رہنمائی کے بعد سرورِ عالم ﷺ کی ذرّہ نوازی تھی کہ آپ نے انصاری کے لیے، ضرورت کے اوزار کو اپنے دست مبارک سے درست فرمایا...... اور کسی مرحلے میں انہیں آزردہ نہ ہونے دیا۔ پھر پندرہ دن کی مدّت اسی لیے مقرر فرمائی، تاکہ اس دوران تجربہ سودمند ہو تو انہیں اسی کام میں لگے رہنے کا حکم دیں، ورنہ بصورت دیگر کوئی دوسرا کام تجویز فرمائیں۔ آج اس بات کی ضرورت ہے کہ غریبی اور افلاس کا علاج اس پارٹ کے تحت کیا جائے جو اس حدیث میں بدرجہ اتم موجود ہے اور یہ طے کر لیا جائے کہ لفظی بحثوں اور کاغذی منصوبوں سے ہٹ کر ایسی صورتیں عمل میں لائی جائیں جس سے بیروزگاری اور گداگری کا انسداد یقینی ہو سکے۔

خلاصہ

گزشتہ صفحات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسان کو خصوصاً مسلمانوں کو افلاس سے نجات پانے کے لیے پوری تندہی اور سرگرمی کے ساتھ کسی کام میں لگ جانا چاہیے۔ خواہ یہ کام صنعت وحرفت یا تجارت ہو، یا کاشتکاری، خوشنویسی یا کسی دفتری نوعیت

کا ہو، اس لیے کہ اس سب کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے گا اور اپنی اور اپنے خاندان کی کفالت کر سکے گا۔ اسے نہ کسی فرد سے امداد لینے کی ضرورت ہوگی اور نہ کسی ادارے یا حکومت سے شکایت ہوگی۔ پھر ایک آدمی کے برسرروزگار...... ہو جانے کے بعد مزید فائدہ یہ ہوگا کہ سارے معاشرے کے سامنے نظیر قائم ہوگی اور اسے دیکھ کر دوسروں میں اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی امنگ پیدا ہوگی۔

اور اگر گنجان آبادی، وسائل کی کمی، یا عام بیروزگاری کی وجہ سے کسی شخص کو اپنے وطن میں روزگار نہ ملے تو ایسے شخص کو چاہیے کہ روزی کی تلاش میں رخت سفر باندھے اور گھر سے نکل پڑے، کیوں کہ اس کے خدا نے روزی کا ذمہ لیا ہے وہ روزی فراہم کرے گا۔ لیکن یہ کہاں ضروری ہے کہ روزی وطن ہی میں ملے گی؟

اسلام عام مسلمانوں کو اس بات کی تلقین کرتا ہے کہ وہ کام کا حوصلہ رکھنے والے مسلم افراد کی دلجوئی اور حوصلہ افزائی کریں۔ ان کے ساتھ مناسب تعاون کریں، تاکہ ان کے اندر باعزت زندگی گزارنے کا جذبہ پیدا ہو۔ چنانچہ ارشاد باری ہے:

﴿ وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ ﴾ (٥/ المآئدة:٢)

''نیک کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو۔''

ہاں گناہ اور ظلم کے کاموں میں کسی کا ساتھ نہ دو، پھر اس میں شک نہیں کہ رعیت اور ماتحتوں کے لیے مناسب روزگار فراہم کرنے کی ذمہ داری حکمران طبقے پر عائد ہوتی ہے، اس لیے کہ اپنی رعیت کے بارے میں خدا کے سامنے انہیں جواب دہی کرنی ہے۔ اسی طرح اگر تلاشِ معاش میں منہمک کسی آدمی کو کوئی مخصوص تیاری یا کسی کام کی ٹریننگ کی ضرورت ہو، جس کے بعد وہ اپنا کام بحسن وخوبی کر سکے گا، تو یہ ذمہ داری بھی حکومت یا سماج کے سربرآوردہ طبقہ اور سرداران قوم پر عائد ہوتی ہے کہ وہ اس سلسلے میں...... زکوٰۃ یا کسی مناسب مد سے ان کی امداد کریں۔

مختصر یہ کہ اسلامی معاشرہ میں شریک حکام سے لے کر ادنیٰ سے ادنیٰ فرد تک ہر ایک پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ بھوک اور افلاس کا مقابلہ کریں اور اس مقصد کے

لیے سرمائے، یا ہمہ قسم کی مادی اور اخلاقی قوتوں کا استعمال کریں۔ اس لیے کہ علم الاقتصاد (Economics) کے ماہرین اس حقیقت کو تسلیم کر چکے ہیں کہ آمدنی اور اس کے ذرائع کی فراوانی ہی غریبی کے اثرات پر کاری ضرب لگا سکتی ہے ورنہ اگر معاشرہ میں چند افراد کام کریں گے اور باقی دوسروں کے دست نگر ہوں گے تو اس میں شک نہیں کہ کام کرنے والوں پر زیادہ بار پڑے گا یا پیداوار کم ہوگی اور بالآخر دولت کم پیدا ہوگی اور غریبی بڑھ جائے گی۔

ہر قوم کے نوجوان اس قوم کے قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں۔ مسلم معاشرے کے اندر موجود نوجوان طبقہ پر بھی یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ سماج کی دیوار میں موجود رخنوں کو بند کرنے کے لیے کامل اتحاد و تعاون کے ساتھ سرگرم عمل رہیں اور ہر ان پیشوں اور صنعت و حرفت کی جستجو میں رہیں جس سے قوم کو اور خود ان کی ذات کو زیادہ سے زیادہ نفع پہنچ سکے۔

یہ صحیح ہے کہ سب لوگ ایک خیال کے نہیں ہوتے اور نہ ہر کسی کو ہم خیال بنایا جا سکتا ہے۔ اس لیے قوم وملت کا صحیح درد رکھنے والے گنتی کے چند افراد بھی اگر اس قسم کے اصلاحی اور انقلابی کاموں کے لیے اٹھ کھڑے ہونگے تو بلاشبہ وہ ساری قوم کی طرف سے کفارہ ہوں گے، ورنہ بصورت دیگر ساری قوم اور خاص طور پر قوم کے سربرآوردہ افراد اس کے جواب دہ ہوں گے۔

- ☆...... مالدار عزیزوں کا سہارا
- ☆...... صلہ رحمی کی تاکید
- ☆...... صلہ رحمی کی اہمیت احادیث کی روشنی میں
- ☆...... اسوۂ صحابہ
- ☆...... عام اسلاف کی رائے
- ☆...... امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک
- ☆...... امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک
- ☆...... خرچ پانے کی شرطیں
- ☆...... خرچ کی مقدار
- ☆...... قرابت داری اسلام کی اہم خصوصیت

مالدار عزیزوں کا سہارا

اسلام میں غریبی کے علاج کا پہلا ذریعہ جیسا کہ گزشتہ قسطوں میں بتایا گیا، یہ ہے کہ غریبی اور افلاس سے ہر کوئی نبرد آزما ہو اور محنت مشقت کو اپنا ہتھیار قرار دے، لیکن اس حقیقت سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا کہ محنت مشقت کرنے کا مطالبہ بھی انہیں سے کیا جا سکتا ہے جن کے اندر محنت کرنے کی صلاحیت ہو، ورنہ ظاہر ہے ان اپاہجوں اور از کار رفتہ افراد کو کام کرنے کے لیے مجبور نہیں کیا جا سکتا جو کام کرنے کی جملہ صلاحیتوں سے محروم ہوتے ہیں، ان بیواؤں اور یتیم و کمسن بچوں سے محنت و مشقت کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا جن کی آنکھوں کے سامنے ان کی دنیا لٹ گئی ہو اور وہ حسرت و نامرادی کا عبرت ناک مرقع بن کر رہ گئے ہوں۔ اسی طرح ان لوگوں کو بھی کام کرنے کے لیے نہیں کہا جا سکتا جو مختلف موذی امراض یا ناگہانی حادثوں کا شکار ہونے کی وجہ سے کمانے کی صلاحیت کھو بیٹھے ہوں اور دوسروں کے ٹکڑوں کے محتاج ہوں، لیکن یہ بھی کسی طرح مناسب نہیں کہ اس قسم کے تمام لوگوں کو زندگی کی چکی میں پسنے اور گرد راہ بننے کے لیے یوں ہی چھوڑ دیا جائے۔ سچ تو یہ ہے کہ جو مذہب سب سے زیادہ انسانیت نواز اور غریبوں کا حقیقی ہمدرد ہو، سسکتے انسانوں کے ساتھ اس حد تک سنگدلی نہیں کر سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ غریبوں کی ہمدردی اور فقر و ناداری سے انہیں نجات دلانے کے لیے اسلام نے انتہائی مثبت اور راست کارروائی یہ کی کہ اس نے خاندان کے تمام افراد کو متحدہ اکائی (UNIT) قرار دیا اور توحید خداوندی کے مطالبہ کے بعد اس بات کا مطالبہ کیا کہ خاص طور پر قرابت داروں کے ساتھ امداد و اعانت، رحم و کرم، وسیع القلبی اور سیر چشمی کا برتاؤ کرے، طاقتور کمزوروں کا خیال رکھے، مالدار ناداروں کی کفالت کرے اور با صلاحیت افراد مجبوروں کو سہارا دیں۔ پھر یہ مطالبہ اس لیے بھی قرینِ عقل و قیاس ہے کہ رشتہ داروں میں آپس میں روابط انتہائی گہرے ہوتے ہیں، ان کے اندر ایک دوسرے کے لیے صلہ رحمی

اور قرابت داری کا جذبہ فطری طور پر موجود ہوتا ہے، جس سے شفقت اور مہربانی کی امیدیں وابستہ ہوتی ہیں اور درحقیقت دنیا کا نظام بھی صلہ رحمی اور قرابت داری کے اسی پاکیزہ جذبہ کے ساتھ قائم ہے، پھر اس طرح اگرچہ ایک فرد کی زندگی کے لیے سکون کا سامان فراہم ہوتا ہے، مگر فی الحقیقت وہ پورے سماج اور تمدنؔ کی صلاح اور کامیابی کے لیے سنگ بنیاد ہوتا ہے، یہی کائنات کی حقیقت اور شریعتِ مطہرہ کا دستور ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

﴿وَأُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ﴾

(۸/ الانفال:۷۵)

''اور جو لوگ رشتہ دار ہیں کتاب اللہ میں ایک دوسرے کی میراث کے زیادہ حقدار ہیں۔''

صلہ رحمی کی تاکید

اسلام صلہ رحمی پر زور دیتا ہے اور قطع رحمی کرنے والوں کو سخت عذاب سے ڈراتا ہے۔ ارشاد ہے:

﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا﴾ (۴/ النسآء:۱)

'' اور اللہ سے ڈرتے رہو، جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے مانگتے ہو اور قرابت کے بارے میں ڈرتے رہو، بے شک اللہ تمہارے حال کا نگران ہے''

﴿وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا﴾

(۱۷/ الاسرآء:۲۶)

''اور رشتہ داروں، محتاجوں اور مسافروں کو ان کا حق ادا کرو اور فضول خرچی نہ کرو۔''

﴿ فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ۫ ﴾ (۳۰/ الروم: ۳۸)

''تو قرابت دار مسکین اور مسافروں کے حقوق ادا کرو۔ یہ ان کے لیے بہتر ہے، جو اللہ کے لیے خوشنودی چاہتے ہیں۔''

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى ﴾

(۱۶/ النحل: ۹۰)

''اللہ تمہیں خاص طور پر قرابت داروں کے ساتھ انصاف اور حسن سلوک سے پیش آنے کا حکم دیتا ہے۔''

﴿ وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۙ ﴾ (٤/ النسآء: ٣٦)

''صرف اللہ کی عبادت کرو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ۔ ماں باپ اور دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو۔ اسی طرح یتیموں فقیروں، پڑوسیوں، دوستوں اور ماتحتوں کے ساتھ محبت سے پیش آؤ اور یہ بات یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ ڈینگ مارنے اور اترانے والوں کو ذرہ برابر بھی پسند نہیں کرتا۔''

اسی مفہوم کی چند حدیثیں بھی سن لیجیے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيَصِلْ رَحِمَهٗ)) [1]

''اللہ اور آخرت کے دن پر کامل اعتماد رکھنے والوں کو صلہ رحمی کا حد درجہ خیال رکھنا چاہیے۔''

((اَلرَّحِمُ مُعَلَّقَةٌ بِسَاقِ الْعَرْشِ تَقُوْلُ: مَنْ وَّصَلَنِيْ وَصَلَهُ اللّٰهُ

[1] بخاری، کتاب الأدب، باب اکرام الضیف وخدمته ایاه بنفسه، رقم: ٦١٣٨۔

وَمَنْ قَطَعَنِیْ قَطَعَهُ اللّٰهُ)) [1]

"رحم، عرش الٰہی سے چمٹا ہوا ہے اور پکار پکار کر کہتا ہے کہ جس نے مجھے جوڑا، اللہ اسے جوڑے گا، لیکن جو کوئی مجھے توڑے گا، اللہ اسے توڑ کر رکھ دے گا۔"

ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا:

((أُمَّكَ وَأَبَاكَ وَأُخْتَكَ وَأَخَاكَ وَمَوْلَاكَ الَّذِیْ يَلِیْ ذَالِكَ حَقًّا وَاجِبًا وَرَحِمًا مَوْصُوْلَةً)) [2]

"تمہارے ماں، باپ، بہن، بھائی اور زر خرید غلاموں کے بہت سارے حقوق تمہارے ذمہ عائد ہوتے ہیں۔ اس لیے تمہیں ان کے ساتھ صلہ رحمی کا برتاؤ کرنا چاہیے۔"

یہ تمام صراحتیں بتاتی ہیں کہ عام انسانوں کے مقابلے میں رشتہ داروں کے حقوق کو سب سے زیادہ اہمیت اور فوقیت اسی لیے حاصل ہے کہ ان میں آپس میں بہت گہرا رشتہ ہوتا ہے جو حسنِ سلوک کا تقاضا کرتا ہے اور یہ ہر کوئی جانتا ہے کہ صلہ رحمی پر محض حقوق کا لیبل چسپاں کر دینے سے اس کی اہمیت نہیں بڑھ جاتی، بلکہ ان حقوق کو تسلیم کرنے اور سچائی کے ساتھ ادا کرنے سے ہی ان کی اہمیت میں نمایاں اضافہ ہوتا ہے۔ نیز عقل و قیاس کی رو سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ اگر کسی عزیز یا رشتہ دار کے مرنے پر اس کا دوسرا رشتہ دار میت کی دولت پا کر زندگی کے دن چین سے گزار سکتا ہے تو انصاف کا عین تقاضا ہے کہ اس کے اپاہج یا مجبور ہونے کی صورت میں اس کی کفالت کی جائے۔ اس کی مشکلات حل کی جائیں، تاکہ یہ مالی اعانت و کفالت اس وراثت کا عوض بن سکے۔

☆ اور اگر کوئی یہ سمجھے کہ مذکورہ بالا صراحتوں سے بس اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ رشتہ داروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا چاہیے، یہ نہیں ثابت ہوتا کہ صلہ رحمی کوئی زبردست فریضے کی حیثیت بھی رکھتا ہے تو اس میں شک نہیں کہ یہ اس کی خام خیالی ہوگی۔ اس لیے کہ اول تو

---

[1] مسلم، کتاب البر والصلة، باب صلة الرحم، رقم: ٦٩١٩۔ [2] زاد المعاد، ذکر حکم رسول الله ﷺ الموافق لکتاب الله تعالیٰ من وجوب النفقة للاقارب، ج ٥، ص: ٥٤٢۔

قرآن پاک اور احادیثِ مقدسہ کی بار بار تاکید سے اسکی حد سے زیادہ اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ دوسرے حکم دینے کا انداز بتاتا ہے کہ یہ عمل زبردست فریضے کی حیثیت رکھتا ہے اور پھر صلہ رحمی کی اہمیت وفرضیت کا اس سے بڑھ کر ثبوت اور کیا ہوگا کہ خود باری تعالیٰ نے کلام پاک میں تقویٰ اختیار کرنے کی تلقین کے فوراً بعد صلہ رحمی کا حکم دیا۔ چنانچہ فرمایا: اللہ سے ڈرو جس کے نام کا تم ایک دوسرے کے سامنے واسطہ دیتے ہو اور رشتہ داروں کا بھی خیال رکھو۔ لیکن اب بھی کوئی اسی فکر میں ہو کہ صلہ رحمی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وقت بے وقت رشتہ داروں کی اعانت وکفالت کی جائے، بلکہ صلہ رحمی سے مراد یہ ہے کہ ان سے رشتہ داری اور تعلق رکھا جائے، نہ یہ کہ ان سے لڑائی جھگڑا کر کے ان سے دشمنی مول لی جائے تو اس قسم کی ذہنیت کے جواب میں ہم کہیں گے کہ یہ نقطۂ نظر بھی حد درجہ کم فہمی کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ اسی قسم کے اوٹ پٹانگ نظریات کا جواب دیتے ہوئے علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ

① اگر صلہ رحمی اسی کا نام ہے تو یہ کہاں کی صلہ رحمی ہوگی؟ کہ آدمی اپنے کسی عزیز کو بھوک پیاس میں تڑپتا دیکھے، لیکن اس کے باوجود اسے روٹی کے چند ٹکڑے اور پانی کے چند گھونٹ نہ دے۔ اسی طرح موسم کے سرد گرم تھپیڑے سہنے کے لیے اسے تنہا چھوڑ دے لیکن اسے کسی قسم کا سہارا نہ دے، حالانکہ مصیبت کا مارا اسی کا بھائی بند ہے اور دونوں میں خون کا رشتہ قائم ہے یا وہ اس کا چچا ہوتا ہے جس کا مرتبہ باپ کے برابر ہوتا ہے، یا وہ مصیبت زدہ عورت رشتہ میں اس کی خالہ ہوتی ہے جو ماں کے برابر ہے۔ پس یہ مجرمانہ غفلت اور سنگدلی اگر قطع رحمی نہیں ہے، تو ہم نہیں جانتے کہ پھر آخر کون سی قطع رحمی سے ہمیں منع کیا گیا ہے۔

② اور اگر صلہ رحمی کا مطلب یہ لیا جائے کہ اپنوں سے محض تعلق باقی رکھا جائے خواہ ان کے ساتھ کسی قسم کا تعاون کیا جائے یا نہ کیا جائے تو ہم کہیں گے کہ یہ غلط ہے۔ اس لیے کہ امداد اور تعاون کے بغیر بھی اگر تعلقات باقی رہتے، تو قرآن پاک اور احادیثِ مقدسہ میں ان کی امداد واعانت اور خبر گیری کے لیے اس قدر زور نہ دیا جاتا۔ پھر اس مفہوم کے درست ماننے کی صورت میں دوسری خرابی یہ لازم آتی ہے کہ قرابتداروں کو عام انسانوں کی سطح پر رکھ دینے سے ان میں اور دوسروں میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا اور نتیجہ یہ ہوتا، کہ نہ کوئی دل وزبان سے ان

کی اہمیت کا قائل ہوتا اور نہ کوئی ان کے ساتھ حسن سلوک کو ضروری قرار دیتا حالانکہ واقعہ اس کے برعکس ہے۔اس لیے کہ حضور ﷺ نے بارہا بھائی بہنوں کے حقوق کو ماں، باپ کے حقوق کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ چنانچہ ایک روایت میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''ماں باپ اور بھائی بہن تمہارے حسن سلوک کے زیادہ مستحق ہیں۔'' [1] اس قسم کے روشن دلائل کے سامنے ہم نہیں سمجھ سکتے کہ رشتہ داروں کے حقوق کو ثانوی حیثیت کس طرح دی جا سکتی ہے؟

صلہ رحمی کی اہمیت احادیث کی روشنی میں

علاوہ ازیں فقہائے اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ بیوی کے خرچ کے لیے شوہر کو، بچوں کے خرچ کے لیے باپ کو اور معذور والدین کی کفالت کے لیے بیٹوں کو مجبور کیا جائے گا یا نہیں؟ اس میں علما کا خفیف سا اختلاف ہے، لیکن اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ ان کے ساتھ ہمدردی اور صلہ رحمی کا رویہّ بہر حال باقی رکھا جائے گا۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ فقۂ اسلامی کے دو مکتب فکر یعنی مکتبِ امام ابوحنیفہ اور امام احمد بن حنبل صلہ رحمی اور ہمدردی کے مسئلے میں سب سے آگے ہیں۔ خود علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ بھی ان کی تائید کرتے ہیں اور اس مضمون کی متعدد روایتیں اپنی کتاب ''زاد المعاد'' [2] میں درج کرتے ہیں۔ آپ لکھتے ہیں:

☆ ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب سنن میں کلیب بن منفعہ رحمۃ اللہ علیہ سے اور انہوں نے اپنے دادا سے روایت کی ہے کہ وہ سرور عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا، یا رسول اللہ! (ﷺ) میرے حسن سلوک کے حقدار کون ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمہارے ماں باپ، بھائی بہن اور زر خرید غلام تمہارے حسن سلوک کے مستحق ہیں۔'' [3]

☆ نسائی نے حضرت طارق صحابی سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا، میں مدینہ پہنچا تو آپ ﷺ منبر پر رونق افروز تھے اور فرما رہے تھے: ''دینے والے کا ہاتھ اونچا ہوتا ہے، ان کی خبر گیری پہلے کرو، جن کی پرورش تمہارے ذمہ عائد ہوتی ہے۔ یعنی تمہارے ماں

---

[1] زاد المعاد، ذکر حکم رسول اللہ ﷺ الموافق لکتاب للہ تعالی من وجوب النفقة للأقارب، ج٥ ص: ٥٤٣۔ [2] زاد المعاد، ذکر حکم رسول اللہ ﷺ الموافق لکتاب للہ تعالی من وجوب النفقة للأقارب، ج٥ ص: ٥٤٢۔

[3] ابوداود، کتاب الأدب، باب فی برّ الوالدین، رقم: ٥١٤٠۔

باپ کی، بہن بھائی کی، پھر تمہارے قریب تر عزیز کی۔" [1]

☆ ترمذی میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر دریافت کیا، اے اللہ کے رسول! میں کس کی زیادہ خدمت کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: "ماں کی۔" عرض کیا، پھر کس کی؟ فرمایا: "ماں کی۔" تیسری بار پھر عرض کیا، پھر کس کی؟ آپ نے فرمایا: "باپ کی، پھر قریبی عزیز کی۔" [2]

☆ حضرت ہندہ سے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا تھا: "تمہیں اپنے اور اپنے بچہ کے خرچ کے لیے شوہر سے بقدر ضرورت روپیہ لینے کا حق حاصل ہے۔" [3]

☆ سنن ابوداؤد میں عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "سب سے پاکیزہ غذا وہ ہے جو تمہاری اپنی کمائی کی ہو۔ ہاں تمہاری اولاد بھی تمہاری کمائی ہیں۔ اس لیے تم بافراغت ان کی کمائی استعمال کر سکتے ہو۔" [4]

☆ نسائی نے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "خیرات دینے سے پہلے اپنے گردوپیش کا جائزہ لو اور اہل وعیال پر خرچ کرنے سے جو بچ رہے اسے قریب و دور کے ضرورت مند اعزہ پر خرچ کرو۔" [5]

---

[1] نسائي، كتاب الزكاة، باب أيتهما اليد العليا، رقم: ٢٥٣٣۔ [2] بخاري، كتاب الأدب، باب من أحق الناس بحسن الصحبة، رقم: ٥٩٧١؛ مسلم، كتاب البر والصله، باب برالوالدين و أيهما أحق بهٗ رقم ٦٥٠١؛ ابوداود، كتاب الأدب، باب في برالوالدين، رقم: ٥١٣٩؛ ترمذي، ابواب البر والصلة، باب ما جاء في برالوالدين، رقم: ١٨٩٧؛ ابن ماجه، كتاب الا دب، باب برالوالدين، رقم: ٣٦٥٨۔ [3] ابن ماجه، كتاب التجارات، باب ما للمرأة من مال زوجها، رقم: ٢٢٩٣؛ دارمي، كتاب النكاح، باب في وجوب نفقة الرجل على اهله، رقم: ٢٢٥٩؛ بخاري، كتاب النفقات، باب اذا لم ينفق الرّجل فللمرأة أن تأخذ بغير علمه وما يكفيها وولدها بالمعروف، رقم٥٣٦٤؛ مسلم، كتاب الأقضية، بأب قضية هند، رقم: ٤٤٧٧؛ ابوداود، كتاب البيوع، باب في الرجل يأخُذ حقه من تحت يده، رقم٣٥٣٢؛ نسائي، كتاب آداب القضاة، باب قضاء الحاكم على الغائب اذا عرفه، رقم: ٥٤٢٢۔

[4] ابوداود، كتاب البيوع، باب الرجل يا كل من مال ولده، رقم: ٣٥٢٨؛ مسند احمد: ٦/ ٢٠٢، رقم: ٢٥١٤٠؛ ابن ماجه، كتاب التجارات، باب الحث على المكاسب، رقم: ٢١٣٧؛ نسائي، كتاب البيوع، باب الحث على الكسب، رقم: ٤٤٥٤؛ دارمي، كتاب البيوع، باب في الكسب و عمل الرجل بيده، رقم: ٢٥٣٧۔ [5] زاد المعاد في ذكر حكم رسول الله الموافق لكتاب الله تعالىٰ من وجوب النفقة للأقارب ج ٥/ ص: ٥٤٤۔

یہ احادیث درحقیقت کلام ربانی: ﴿وَاعْبُدُوا اللّٰهَ ......﴾ ''اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور قرابت داروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو۔'' کی صاف ترجمانی کرتی ہیں۔ چنانچہ خداوند عالم نے والدین کے حقوق کو رشتہ داروں کے حقوق پر مقدم کیا اور سرور عالم ﷺ نے بھی اپنے فرمودات میں اس کی تاکید کی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے تنبیہ کی کہ رشتہ داروں کے رشتہ دار پر حقوق ہیں۔ جن کی ادائیگی ان پر لازم ہے۔

اب اگر مذکورہ بالا حقوق کے مستحق رشتہ دار نہیں تو ہم نہیں جانتے کہ پھر ان کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ کیا جانا چاہیے؟ بھلا اس سے بڑھ کر حق تلفی اور ناحق شناسی اور کیا ہوگی؟ کہ قرابتداروں کو بلکتے اور ایڑیاں رگڑتے دیکھا جائے اور وسعت کے باوجود ان کی دستگیری اور امداد نہ کی جائے؟

غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ گزشتہ تمام احادیث کا سرچشمہ قرآن پاک کی یہ آیت ہے:

﴿وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۳۳)

''اور مائیں اپنے بچوں کو دو سال کامل دودھ پلایا کریں۔ یہ مدت اس کے لیے ہے، جو شیر خوارگی کی تکمیل کرنا چاہے اور جس کا بچہ یعنی باپ، اس کے ذمہ ہے ان ماؤں کا کھانا اور کپڑا قاعدے کے موافق، کسی شخص کو حکم نہیں دیا جاتا مگر اس کی برداشت کے موافق، کسی ماں کو تکلیف نہ پہنچائی جائے اس کے بچہ کی وجہ سے اور نہ کسی باپ کو تکلیف پہنچائی جائے اس کے بچے کی وجہ سے۔''

قرآن کریم نے فرزند و پدر کے ایک دوسرے سے متعلق سارے حقوق چند الفاظ میں جس طرح بیان کر دیے ہیں یہ اس کا اعجاز ہے۔

اسوۂ صحابہ

خلیفۂ دوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا طریق کار تھا کہ آپ قرابت داروں کے ساتھ ہمدردی کا سختی سے حکم دیا کرتے تھے۔ چنانچہ سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ اپنی سند کے ساتھ حضرت سعید بن میسّب رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک بچے کے سرپرست کو اس لیے قید کیا تھا کہ وہ اس کی پرورش میں سستی کرتا تھا۔

ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن میسّب رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کی ہے کہ ایک یتیم کا رشتہ دار خلیفۂ دوم کے دربار میں حاضر ہوا، آپ نے اس سے یتیم کی خبر گیری کے لیے کہا، پھر فرمایا: اگر یہ اس کا دور کا رشتہ دار نہ ہوتا تو میں نفقہ اس کے ذمہ فرض قرار دیتا۔

ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا یہ فیصلہ نقل کیا ہے کہ جب کسی بچے کی ماں اور اس کے چچا موجود ہوں تو دونوں کو بچے کی ذات پر اسی قدر خرچ کرنا ہوگا جس قدر حصہ انہیں ترکے میں مل سکتا ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ صحابہ کے ان فیصلوں پر کبھی کوئی اعتراض نہیں کیا گیا۔

عام اسلاف کی رائے

ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے عطاء رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا، کیا وارث کے اوپر بھی اس کے حصۂ اسلامی کے مطابق خرچ کرنا ضروری ہے؟ انہوں نے جواب دیا کیوں نہیں! یتیم کے ورثاء بھی یتیم پر اسی قدر خرچ کریں گے، جس قدر خود انہیں اس کے ترکے سے ملے گا، ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا، پھر کیا بچے کا وارث خرچ نہ رکھنے کی صورت میں قید بھی کیا جا سکتا ہے؟ جواب میں حضرت عطاء نے کہا، تو کیا اسے یونہی مرنے دیا جائے گا؟ حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی منقول ہے۔

ہمارے اسلاف کی ایک بڑی جماعت کا یہی فیصلہ ہے، جس میں حضرت قتادہ مجاہد، ضحاک، زید بن اسلم، قاضی شریح اور ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہم شریک ہیں۔ نیز قبیصہ بن ذویب، عبداللہ بن عتبہ، شعبی، سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ سے بھی یہی منقول ہے۔

پھر علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے رشتہ داروں پر خرچ کرنے کے سلسلے میں مختلف فقہا کے مذاہب ذکر کیے ہیں۔ ان میں وسعت علی الترتیب امام ابوحنیفہ، امام احمد بن حنبل، امام شافعی اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہم کے مسلک میں پائی جاتی ہے ان میں سے اوّل الذکر دو مسلک کی کسی قدر تفصیل درج کی جاتی ہے۔ [1]

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک یہ ہے کہ ذوی الارحام میں سے ہر ایک دوسرے کی کفالت اور نگہداشت کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیٹے، پوتے اور باپ، دادے، سب کے نفقہ کی ادائیگی ان کے نزدیک آدمی پر لازم آتی ہے۔ خواہ ان کا مذہب ایک ہو، یا نہ ہو، البتہ جو رشتہ دار ذوی الارحام نہ ہوں گے ان کا نفقہ اسی وقت واجب ہوگا جب کہ دونوں کا مذہب بھی ایک ہوگا۔

پھر امام صاحب کے نزدیک دینے والے کی حیثیت اور لینے والے کی ضرورت کا بطور خاص لحاظ رکھا جائے گا۔ یعنی اگر لینے والا خوردسال ہوگا تو صرف نادار مسلم ہونے کی صورت میں اسے نفقہ مل سکے گا، البتہ لڑکی بالغ ہونے کے باوجود خرچ لینے کی حقدار تصور کی جائے گی اور اگر لینے والا بالغ ہو جائے تو نفقہ پانے کا حق اسی وقت ہوگا جب کہ مفلس ہونے کے ساتھ ساتھ وہ آنکھ سے معذور یا اپاہج بھی ہو، ورنہ بصورت دیگر اسے نفقہ نہ ملے گا۔ علاوہ ازیں لینے والے سے نفقہ اسی قدر لیا جائے گا جتنا کہ اس شخص کے ترکے سے خود اسے حصہ ملے گا، البتہ مشہور مذہب کی رو سے بچہ کا خرچ صرف باپ برداشت کرے گا، لیکن حسن بن زیاد لؤلوی (شاگرد امام ابوحنیفہ) کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ماں اور

[1] زاد المعاد، ذکر حکم رسول اللہ ﷺ الموافق لکتاب اللہ تعالیٰ من وجوب النفقة للأقارب، ج ۵ ص: ۵٤٦، ۵٤٨۔

باپ دونوں بچے کے خرچ کے ذمہ دار ہوں گے، اس روایت کی بنیاد تمام تر قیاس پر مبنی ہے۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک یہ ہے کہ نسبی قرابت دار کو بہر صورت اپنے نسبی عزیز کے اخراجات کی کفالت کرنی ہوگی، خواہ ترکہ میں اسے کوئی حصہ ملے یا نہ ملے، ہاں نسبی قرابت نہ ہونے کی صورت میں کفالت کی ذمہ داری اس پر اسی وقت آئے گی جب کہ انہیں ایک دوسرے کے ترکے سے حصہ لینے کا حق پہنچتا ہو اور اگر قرابت دار ذوی الارحام سے تعلق رکھتے ہوں جنہیں وراثت نہیں ملا کرتی تو صریح روایت کی رو سے کفالت کی ذمہ داری ان پر عائد نہ ہوگی۔ اس لیے کہ ان کے نزدیک یہ امر مسلم ہے کہ جس کو وراثت ملتی ہے اس کے سر خرچ بھی ڈالا جاتا ہے، لیکن امام صاحب کے بعض اصحاب نے کسی قیاس کے ذریعے ان پر پھر خرچ کی ذمہ داری عائد کی ہے۔ پھر امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ......خرچ لینے اور دینے والے کے درمیان دینی وحدت ہونا ضروری ہے، لیکن ایک روایت کی رو سے نسبی رشتہ دار اس ضابطے سے مستثنیٰ مانا گیا ہے۔ اسی لیے اسے بہر صورت خرچ ملے گا اور اگر نسبی قرابت دار پاکیزہ زندگی بسر کرنے کے لیے شادی کا خواہشمند ہو تو اس سلسلے میں بھی اس کی خاطر خواہ امداد کی جائے گی۔

چنانچہ قاضی ابویعلی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے، باعزت زندگی گزارنے کے لیے شادی کی سہولت ہر اس فرد کے لیے مہیا کی جائے گی جس کا خرچ کسی حال میں بھی آدمی پر ضروری ہوتا ہے۔ جیسے بھتیجے اور چچا زاد بھائی وغیرہ، علاوہ ازیں ظاہر مذہب کی رو سے مرد کے ساتھ ساتھ اس کی اہلیہ کا خرچ بھی علیحدہ سے دیا جائے گا۔ خیال رہے کہ یہ مسلک امام احمد رحمۃ اللہ علیہ بن حنبل کا ہے، جو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک سے کہیں زیادہ وسعت اور فراخی کا حامل ہے۔ البتہ امام ابوحنیفہ کا مسلک ایک اور وجہ سے اپنے اندر وسعت رکھتا ہے۔ وہ یہ کہ ان کے نزدیک ذوی الارحام پر بھی خرچ کی ذمہ داری ڈال دی گئی ہے۔ جبکہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے اس قسم کی کوئی صراحت منقول نہیں ہے۔ ہاں ان کے کچھ مسلمہ

اصول ایسے ضرور ملتے ہیں جن سے امام ابوحنیفہ کے اس قول کی تائید ہوتی ہے۔ پھر ان کے قول کو مزید تقویت اس لیے بھی ہوتی ہے کہ باری تعالیٰ نے وراثت کا ٹھوس قانون خاص اس مقصد کے لیے نافذ کیا اور بیشتر احادیث نبوی صلہ رحمی کے عنوان سے اس کی اہمیت کو ظاہر کرتی ہیں۔ [1]

خرچ پانے کی شرطیں

① یہ ضروری ہے اور عقل وقیاس کے عین مطابق بھی کہ خرچ پانے والا نادار اور فقیر ہو۔ ورنہ دولت پانے یا کمانے کی صلاحیت میسر آنے پر اسے خرچ لینے کا کوئی حق نہ ہوگا۔

② اسی طرح دینے والے کے پاس بھی اپنی اور اپنے اہل وعیال کی ضروریات سے فاضل رقم موجود ہونی چاہیے۔

چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''پہلے اپنی ذات پر خرچ کرو، پھر اس پر خرچ کرو جس کی کفالت کے تم ذمہ دار ہو۔'' یہ اسی لیے کہ رشتہ دار کو محض اس کی دلجوئی کے لیے نفقہ ملا کرتا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ کوئی بھی دوسرے کی نگہداشت اور وکالت اسی وقت کر سکتا ہے جب کہ وہ خود اور اس کے اہل وعیال فارغ البال اور آسودہ حال ہوں۔ [2]

خرچ کی مقدار

ہر چند کہ اسلام نے رشتہ داروں کی مالی اعانت کی طرف بار بار توجہ دلائی ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کے باوجود اس کی کوئی تعداد مقرر نہیں کی ہے اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ دینے والے کے حالات اور لینے والے کی ضروریات یکساں نہیں ہوا کرتیں۔ ایسی صورت میں اسلام نے مناسب یہی سمجھا کہ دینے والوں کی حیثیت اور لینے والوں کی

[1] زاد المعاد، ذکر حکم رسول اللہ ﷺ الموافق لکتاب اللہ تعالیٰ من وجوب النفقة للأقارب، ج ٥/ ص: ٥٤٩۔ [2] نسائی، کتاب الزکاۃ، باب ای الصدقة افضل، رقم: ٢٥٤٧؛ زاد المعاد، ذکر حکم رسول اللہ ﷺ الموافق لکتاب اللہ تعالیٰ من وجوب النفقة للاقارب، ج ٥ ص: ٥٤٤۔

ضرورت کو مدنظر رکھ کر دیا جائے اور اس قدر امداد و اعانت بہر حال کر دی جائے جس سے حسب دستور ان کی ضرورت پوری ہو جائے، چنانچہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿لِيُنفِقْ ذُو سَعَةٍ مِّن سَعَتِهِ ۖ وَمَن قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ ۚ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا مَا آتَاهَا ۚ﴾ (٦٥/ الطلاق:٧)

''وسعت والا اپنی حیثیت کے مطابق اور کم آمدنی والا اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرے اور یہ یاد رکھے کہ اللہ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔''

﴿وَمَتِّعُوهُنَّ عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ﴾ (٢/ البقرة:٢٣٦)

''اور ان کو جوڑا دو، صاحب وسعت کے ذمہ اس کی حیثیت کے مطابق اور تنگ دست کے ذمے اس کی حیثیت کے مطابق۔''

سرور عالم ﷺ نے حضرت ہندہ رضی اللہ عنہا زوجہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا۔ اپنے شوہر کے مال سے اخراجات کے لیے اتنا لے سکتی ہو، جو قاعدہ کے مطابق تمہارے لیے اور تمہارے بچوں کے لیے کافی ہو سکے۔ [1]

پھر فقہائے کرام نے صراحت کی ہے کہ حسب ذیل ضروریات کے لیے مناسب سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔

① خورد و نوش کی اشیاء
② سردی گرمی کے لحاظ سے مناسب کپڑے
③ رہائش کے لیے مکان اور گھر کا اثاثہ
④ معذور اپاہج ہونے کی صورت میں کوئی ایسا خدمت گزار جو اس کے لیے

[1] بخاری، کتاب النفقات، باب اذا لم ینفق الرجل فللمرأة أن تاخذ بغیر علمه ما یکفیها وولدها بالمعروف، رقم: ٥٣٦٤؛ مسلم، کتابه الأقضية، باب قضية هند، رقم ٤٤٧٧؛ ابوداود، کتاب البیوع، باب فی الرجل یأخذ حقه من تحت یده، رقم: ٣٥٣٢؛ نسائی، کتاب آداب القضاة، باب قضاء الحاکم علی الغائب اذا عرفه، رقم: ٥٤٢٢۔

سہارا بن سکے

⑤ شادی کی خواہش رکھنے والوں کے لیے ازدواجی سہولت

⑥ بیوی بچوں کے لیے معاشی بندوبست

شیخ الاسلام علامہ ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ''کافی'' ج۲ص۱۰۰۲،۱۰۳۲ میں لکھتے ہیں:

غریب رشتہ داروں کو جیسی ضرورت ہوگی، اسی کے مطابق ان کی امداد کی جائے گی۔ یہاں تک کہ بے حد معذور ہونے کی صورت میں خدمت گزار یا بیوی موجود ہونے کی صورت میں ان کے اخراجات کی کفالت بھی کی جائے گی، نیز جن کی کفالت اس کے ذمہ ہے وہ یا اس کے باپ اور دادا کو بھی شادی کی ضرورت ہو تو مناسب طریقے سے اس ضرورت کی تکمیل کی جائے گی، تاکہ ان کی زندگی سکھی ہو۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ بیمار اعزہ کے علاج معالجے سے متعلق کوئی صراحت فقہانے نہیں کی ہے جس کی وجہ بظاہر یہ ہوسکتی ہے کہ بیماریاں روز روز نہیں ہوتیں، اس لیے روز مرہ کے اخراجات سے اس کا تعلق نہیں۔ دوسری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ترقی کے اس دور سے پہلے تشخیص وعلاج کی بنیاد تمام تر تخمینے اور اندازے پر قائم تھی، یہی وجہ ہے کہ ان دونوں لوگ اپنے علاج کی طرف بھی کم توجہ دیا کرتے تھے۔ اس لیے دوسروں کا علاج کرنے کے لیے انہیں آمادہ کرنا اتنا آسان نہ تھا، لیکن آج کے ترقی یافتہ دور میں صورت حال بالکل بدل چکی ہے اور امراض کی تشخیص اور ان کا علاج بڑی حد تک یقینی ہو چکا ہے۔ اس لیے اب کسی عزیز کو موذی امراض کے بھیانک شکنجے میں سسکتا ہوا چھوڑ دینا انتہا درجے کی سنگدلی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ علاج معالجے کی سہولیات بھی ضروری اخراجات کی فہرست میں شامل تصور کی جائیں گی۔ اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا:

((يَا عِبَادَ اللّٰهِ! تَدَاوَوْا فَإِنَّ الَّذِىْ خَلَقَ الدَّاءَ خَلَقَ الدَّوَاءَ)) [1]

[1] ترمذی، کتاب الطب، باب ما جاء فی الدواء والحث علیه، رقم: ۲۰۳۸؛ ابوداود، کتاب الطب، باب ما جاء فی الرجل یتداوی، رقم: ۳۸۵۵؛ ابن ماجه، کتاب الطب، باب ما انزل الله داءً الّا انزل لهٗ شفاء، رقم: ۳۴۳۶؛ مسند احمد: ۳/ ۱۵۶، رقم: ۱۲۱۸۶۔

"خدا کے بندو! علاج معالجے سے پہلوتہی نہ کرو اس لیے کہ جس اللہ نے امراض پیدا کیے ہیں۔ اسی اللہ نے اس کی دوائیں بھی پیدا کر رکھی ہیں۔"

اسلام کی اہم خصوصیات

اس میں شک نہیں کہ غریب عزیزوں کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم فطری طور پر تمدن اور تعمیر عالم کے لیے سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ جیسا کہ بتایا گیا، یہ کوئی معمولی حکم نہیں، بلکہ اسلام جو اسلامی ہمدردی اور صالح تعمیر و تمدن کو ایک اہم مقصد اور نصب العین قرار دیتا ہے، اس حکم کے ذریعے نہ صرف ایک فرد کی زندگی کے لیے سکون و مسرت کا سامان فراہم کرتا ہے، بلکہ وہ پوری انسانیت کے گلدستے کو زیادہ سے زیادہ شاداب اور تازہ رکھنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں تک قرابت اور رحم کا تعلق ہے یہ صرف اسلام کی تنہا خصوصیت ہے کہ وہ قرابتداری کو بہرصورت لازمی قرار دیتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ اب عبادت صرف خدا پرستی کا نام نہ رہا بلکہ ان حقوق کا احترام بھی عبادت کا جزو بن گیا ہے۔

پھر دوسری طرف فقہ اسلامی نے حسن سلوک کی مختلف صورتوں کو اور قرابت داروں کے مختلف حقوق کو جس تفصیل سے بیان کیا ہے ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ قدیم یا جدید کسی مذہب یا ازم کے دستور میں اس کی اتنی ٹھوس اور مکمل تصویر نہیں مل سکے گی۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ خرچ کے حصول کے لیے ایک نادار مسلمان بھی اپنے مالدار عزیز کے خلاف اس یقین کے ساتھ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتا ہے کہ فیصلہ بالآخر اسی کے حق میں ہوگا۔ اسی طرح شرعی عدالتیں بھی اس کی پابند ہوں گی کہ حق دار کو اس کے حقوق سے محروم نہ کیا جائے گا۔

پھر ہم لوگ جن کی پرورش اور نشو و نما خوش قسمتی سے، اسلامی ملکوں یا مسلم معاشرے میں ہوئی ہے۔ ان حقوق کو واضح اور فطرت کے عین مطابق اور لامحالہ سمجھتے ہوں گے اور اس کی وجہ یہی ہے کہ شروع ہی سے ہمارے یہاں اس کی تعلیم اور اس پر عمل درآمد ہوتا آیا ہے، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دورِ حاضر کی بعض قومیں اسے عجوبہ

تصور کرتی ہیں اور یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم بھی تہذیب وتمدن کے میدان میں انہیں کو اپنا پیشرو اور پیشوا سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے محترم استاذ ڈاکٹر محمد یوسف مرسی اپنی کتاب ''دنیا کو اسلام کی ضرورت'' میں اسلام کے عائلی نظام پر بحث کے دوران لکھتے ہیں:

اس موقع پر فرانس کے اس واقعہ کا ذکر بیجا نہ ہوگا، جو میرے وہاں قیام کے دوران پیش آیا...... ہوا یہ کہ میں جس خاندان میں مقیم تھا، وہاں ایک نوجوان لڑکی گھریلو کام کاج کے لیے ملازمہ تھی۔ اس کے چہرے سے خاندانی شرافت اور عالی نسبی جھلکتی تھی۔ میں نے اپنی میزبان عورت سے دریافت کیا، اس کی کفالت کرنے والا کوئی نہیں ہے، جس کی وجہ سے اسے ملازمت کرنی پڑ رہی ہے؟ میزبان نے جواب دیا۔ یہ لڑکی شہر کے اونچے گھرانے سے تعلق رکھتی ہے، اس کا چچا کافی دولت مند ہے، لیکن ساتھ ہی لا ابالی اور بے فکرا ہے۔ اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔ میں نے کہا، پھر خرچ کے لیے یہ اپنے چچا کے خلاف کورٹ میں دعویٰ کیوں نہیں دائر کرتی؟ میزبان میرا منہ تکنے لگی اور سخت حیرت واستعجاب کے لہجے میں کہنے لگی، تو کیا کوئی قانون اس بات کی اجازت دیتا ہے؟ میں نے کہا، کیوں نہیں! پھر میں نے اسے بتایا کہ ایسے حالات میں اسلامی تعلیمات کیا ہیں؟ اور اس دستور میں قرابت داری کی کیا اہمیت ہے۔ وہ خاموشی سے میری باتیں سنتی رہی اور پھر گہرے کرب اور حسرت کے لہجے میں کہنے لگی، قانون سازی کی یہ اسپرٹ کہاں؟ بھلا تم ہی سوچو اگر اس قسم کا قانونی جواز ہمارے یہاں موجود ہوتا تو اچھے گھرانوں کی یہ شریف زادیاں کیوں کسی فیکٹری، کمپنی یا حکومت کے دفاتر میں تلاش معاش کے لیے یوں سرگرداں اور حیران پھرتیں؟ (دنیا کو اسلام کی ضرورت ص ۳۰۴)

☆...... زکوٰۃ کی فرضیت
☆...... شرطیہ علاج
☆...... صدقۂ فطر
☆...... اسلام میں زکوٰۃ کا مقام
☆...... زکوٰۃ کی اہمیت
☆...... زکوٰۃ نہ دینے پر عذاب
☆...... زکوٰۃ عقل کی روشنی میں
☆...... زکوٰۃ ایک مطالبہ
☆...... زکوٰۃ ایک قرض
☆...... زکوٰۃ کی روح
☆...... غریبوں کے لیے کیوں؟
☆...... زکوٰۃ کی مقدار
☆...... زکوٰۃ کے لیے حکومتی یا جماعتی نظام
☆...... قرآن پاک کی صراحت
☆...... اجتماعی نظام کی ضرورت
☆...... صحابہ کے فیصلے
☆...... اجتماعی نظام کی حکمتیں
☆...... بیت المال
☆...... فقیر اور مساکین کون؟
☆...... فقیروں کی ایک قسم
☆...... تندرست کمانے والا زکوٰۃ نہیں لے سکتا
☆...... دائمی علاج
☆...... زکوٰۃ وہ اس طرح دیتے تھے؟
☆...... زکوٰۃ کیسے دی جائے؟
☆...... زکوٰۃ کے اثرات
☆...... زکوٰۃ اور ٹیکس
☆...... مقامی تقسیم پر زور
☆...... ہمہ گیر سماجی کفالت

تیسرا ذریعہ زکوٰۃ

زکوٰۃ کی فرضیت؟

اس میں شک نہیں کہ اسلام نے ہر کس و ناکس کو اپنی اور اپنے خاندان کی جملہ ضروریات کی تکمیل کے لیے محنت مشقت کے ذریعہ اپنی روزی خود فراہم کرنے کا پابند کیا۔ پھر یہ بھی بتایا کہ جو لوگ مفلس اور تہی دست ہونے کے ساتھ ساتھ محنت مشقت سے عاجز ہوں، ان کے خوشحال رشتہ داروں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ان کی کفالت اور مناسب نگہداشت کریں، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہر مفلس کو دولت مند عزیز یا قریبی رشتہ دار میسر نہیں ہوتے، ایسے نازک موقع پر یہ سوال ضرور پیدا ہوگا کہ اس قسم کے نادار یتیموں، بیواؤں اور سن رسیدہ مردوں اور عورتوں کا کیا ہوگا؟ کم سن بچوں، اپاہج، بیمار اور مصیبت زدہ افراد کو معاشرے میں پنپنے کے مواقع کیوں کر حاصل ہوں گے؟ اسی طرح وہ لوگ کس طرح روزی حاصل کر سکیں گے جن کے اندر کام کرنے کی پوری صلاحیت اور حوصلہ ہے، لیکن انہیں روزگار نہیں ملتا، یا وہ لوگ کیا کریں گے جو برسرِ روزگار تو ہیں لیکن کم آمدنی اور زیادہ خرچ کی وجہ سے پریشان ہیں۔ کیا یہ مناسب ہوگا کہ انہیں بھوک اور افلاس کے شکنجے میں سسکنے کے لیے یوں ہی چھوڑ دیا جائے؟ جب کہ ان کے اردگرد ایسے افراد بھی موجود ہوں جو ان کے درد کا علاج جانتے ہوں، لیکن پھر بھی خاموش ہوں!

یقیناً اسلام انہیں فراموش نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے دولت کے امین اور اس کی نگرانی کرنے والوں سے اس بات کا مطالبہ کیا کہ وہ بنیادی اور شرعی حقوق کی بجا آوری اور ضروریات زندگی کی تکمیل کے بعد جو کچھ بچ رہے اس کی ایک مخصوص مقدار اپنے بھائیوں پر خرچ کریں جو زندگی کے اس سفر میں ان سے بہت دور جا پڑے ہیں۔ اسی مطالبے کا نام زکوٰۃ ہے۔

اسلامی قانون کا مطالعہ بتاتا ہے کہ غربا اور مساکین، زکوٰۃ کے اولین حقدار ہیں۔

بیشتر روایتیں ایسی ملتی ہیں جن میں بقیہ مصارف کی بجائے اسی ایک مصرف کا ذکر کیا گیا ہے! دراصل اس کی وجہ یہی ہے کہ دیگر مصارف کی بنیاد بھی یہی غریبی اور افلاس ہے۔ چنانچہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن روانہ کرنے سے پہلے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم دیا تھا کہ ''یمن کے دولتمندوں سے زکوٰۃ وصول کرنا اور وہیں کے غریبوں میں اسے تقسیم کر دینا۔'' [1]

زکوٰۃ، غریبی کا شرطیہ علاج

جس طرح غریبی ایک ہمہ گیر مسئلہ ہے، اس کے انسداد کے لیے زکوٰۃ کی مدد سے حاصل شدہ آمدنی بھی کسی طرح ناکافی یا محدود نہیں، اس لیے کہ حصول زکوٰۃ کے کئی ذرائع ہیں اور ہر ذریعہ اپنی جگہ مضبوط بنیادوں پر استوار ہے۔ مثال کے طور پر ایک ذریعہ کھیتوں اور باغوں سے حاصل ہونے والی پیداوار ہے جس سے حسب قاعدہ چالیسواں یا بیسواں حصہ زکوٰۃ کے نام سے علیحدہ کیا جاتا ہے۔ اس زکوٰۃ کا ایک نام عشر بھی ہے، جس کی وسعت کا اندازہ قرآن پاک کی اس آیت سے ہوتا ہے:

﴿وَمِمَّآ أَخْرَجْنَا لَكُم مِّنَ الْأَرْضِ﴾ (۲/ البقرة:۲۶۷)

''اور (خرچ کرو) اس میں سے جو کچھ ہم نے تمہارے لیے زمین سے پیدا کیا۔''

اس حدیث نبوی سے بھی اس عموم کا پتہ چلتا ہے:

((فِيمَا سَقَتِ السَّمَآءُ الْعُشْرُ، وَفِيمَا سُقِيَ بِالنَّضْحِ نِصْفُ الْعُشْرِ)) [2]

''بارش کے پانی سے حاصل شدہ پیداوار پر عشر (دسواں حصہ) اور اگر پانی

[1] بخاری، کتاب الزکاة، باب وجوب الزکاة، رقم: ۱۳۹۵؛ ابوداود، کتاب الزکاة، باب فی زکاة السائمة، رقم: ۱۵۸۴؛ ترمذی، کتاب الزکاة، باب فی کراھیة أخذ خیار المال فی الصدقة، رقم: ۶۲۵؛ نسائی، کتاب الزکاة، باب وجوب الزکاة، رقم ۲۴۳۷۔

[2] بخاری، کتاب الزکاة، باب العشر فیما یسقی من ماء السماء والماء الجاری، رقم: ۱۴۸۳؛ مسلم، کتاب الزکاة، باب ما فیه العشر او نصف العشر، رقم: ۲۲۷۲؛ ابوداود، کتاب الزکاة، باب فی صدقة الزرع، رقم: ۱۵۹۶؛ ترمذی، کتاب الزکاة، باب فی الصدقة ما یسقی بالأنهار، رقم: ۶۳۹؛ نسائی، کتاب الزکاة، باب ما یوجب العشر و ا یوجب نصف العشر، رقم ۲۴۹۰۔

کے حصول میں مشقت ہو تو اس پیداوار میں نصف عشر (بیسواں حصہ دینا ضروری) ہے۔''

زرعی پیداوار کی طرح فیکٹری، کارخانے (کرائے کے) مکانات، اور آمدنی کے دیگر وسائل جن سے شہری آبادی کے بڑے حصے کی معاشی ضرورتیں وابستہ ہوتی ہیں۔ مخصوص شرطوں کے ساتھ ان کی پیداوار پر بھی زکوٰۃ کا فریضہ عائد ہوتا ہے۔ شہد کی مکھی سے حاصل ہونے والی شہد جو دراصل زراعتی پیداوار کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ عقل و نقل کی رو سے اس کا دسواں حصہ بھی بطور زکوٰۃ واجب ہوگا۔

شہد پر قیاس کرتے ہوئے ریشم کے کیڑوں سے حاصل ہونے والی ریشم، پالتو مویشیوں اور گائے بھینس وغیرہ کے دودھ سے حاصل ہونے والی آمدنی کا عشر بھی بطور زکوٰۃ لیا جا سکتا ہے۔

ان مسائل میں قیاس کی حیثیت ایک شرعی دلیل کی سی ہے، جس کا ثبوت نص قرآنی سے ہوتا ہے۔ اصول فقہ کی کتابوں میں قیاس کے لیے متعدد ایسی شرطیں ملتی ہیں۔ جس کی بنا پر ایسا کوئی قیاس نہیں کیا جا سکتا جس میں دو مختلف چیزوں میں بلا وجہ یکسانیت دکھائی جائے۔ یا دو یکساں چیزوں میں فرق ثابت کیا جائے، اس لیے کہا اگر ایسا ہوا تو قیاس کی روح باقی نہ رہے گی۔

نقد زرِ سرمایہ اور تجارتی اسباب کی قیمت کا چالیسواں حصہ بطور زکوٰۃ واجب ہوگا۔ البتہ یہ ضروری ہوگا کہ ان کا مالک مسلمان ہونے کے ساتھ صاحبِ نصاب ہو۔ اس کے ذمہ کوئی قرض نہ ہو اور اس کے اہل و عیال کی روزمرہ کی ضروریات سے فاضل سرمایہ نصاب کی شکل میں اس کے پاس موجود ہو۔

مویشی جنہیں دودھ اور نسل کی افزائش کے لیے پالا جائے، جیسے اونٹ گائے اور بکری وغیرہ۔ اگر ان کی تعداد نصاب کے مطابق ہو جائے اور سال کے بڑے حصہ تک ان کی گزران، عام چراگاہوں میں ہوئی ہو تو ان پر بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

البتہ امام مالک کے نزدیک مویشیوں پر بہرصورت زکوٰۃ آئے گی، خواہ چرائی کا بار اس کے مالک نے سال بھر خود برداشت کیا ہو۔

زکوٰۃ کی مقدار کا تعین ملکیت رکھنے والے کی مشقت اور سہولت کو مدنظر رکھ کر کیا گیا ہے۔ چنانچہ جو مال آدمی کو اچانک اور یکجا طور پر مل جائے مثلاً: کان، یا معدنی خزانہ وغیرہ تو اس میں سال گزرنے کا انتظار نہیں کیا جائے گا، بلکہ جس وقت وہ حاصل ہوگا، اسی وقت کل مال کا پانچواں حصہ وصول کر لیا جائے گا، اس لیے کہ سال کی قید افزائش اور منافع کے حصول کے لیے ہوتی ہے اور یہ کل کا کل نفع ہے۔ البتہ علما و محققین اس بارے میں اختلاف رکھتے ہیں کہ آیا یہ پانچواں حصہ زکوٰۃ کے مد میں خرچ کیا جائے گا یا مال غنیمت کی طرح ملکی ضروریات اس کا مصرف ہوگا۔

صدقۂ فطر

اسلام میں مال کی زکوٰۃ کے علاوہ ایک اور زکوٰۃ ہے جو جان پر واجب ہوتی ہے اور صدقۂ فطر کے نام سے موسوم ہے۔ یہ روزوں کی ادائیگی اور عید کی آمد کی خوشی میں شکرانے کے طور پر ادا کی جاتی ہے۔ اس کے اندر دو حکمتیں ہیں۔

① روزوں کی ادائیگی میں جو قصور اور نقص شامل ہو گیا ہو، اس کی تلافی ہو جائے۔

② غریبوں کی دلدہی کی جائے اور ان میں یہ احساس پیدا کیا جائے کہ اسلامی معاشرہ اور تمام مسلمان ان کے بھائی بند ہیں اور ان کے دکھ درد میں برابر کے شریک ہیں۔

چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

فَرَضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ زَكَاةَ الْفِطْرِ طُهْرَةً لِلصِّيَامِ مِنَ اللَّغْوِ وَالرَّفَثِ وَطُعْمَةً لِلْمَسَاكِيْنِ۔[1]

”صدقۂ فطر کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ روزہ دار کے نقائص اور خامیوں کا

[1] ابن ماجه، كتاب الزكاة، باب صدقة الفطر، رقم: ١٨٢٧؛ ابوداود، كتاب الزكاة، باب زكاة الفطر، رقم: ١٦٠٩۔

ازالہ ہو اور غریبوں کے لیے روزی مہیا ہو، اس لیے یہ فرض ہے۔''

صدقۂ فطر ایک سالانہ فریضہ ہے، جو اپنے اندر کچھ خصوصیات رکھتا ہے۔

(الف) یہ جان کا صدقہ ہے، اس لیے اس کی ادائیگی کے لیے مالی استطاعت شرط نہیں۔

(ب) زکوٰۃ جس طرح صاحبِ نصاب مالداروں پر فرض ہے، صدقۂ فطر عام مسلمانوں پر فرض ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے اس کی ادائیگی ہر مسلمان پر عائد کی ہے۔ خواہ وہ آزاد ہو یا غلام، مرد ہو یا عورت، امیر ہو یا غریب، البتہ اس کے پاس اتنا غلہ ہونا ضروری ہے کہ جو اس کے اور اس کے اہل وعیال کی ایک روزہ ضروریات سے فاضل ہو۔

صدقۂ فطر کی فرضیت کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مسلمان خواہ دولت مند ہو یا تہی دست، اپنے جیسے دوسرے بھائیوں کی ہمدردی اور ان کے دکھ درد میں شریک ہونے کے لیے ہمہ تن تیار ہو اور یہ یاد رکھے کہ اس کا ہاتھ سدا اونچا رہے۔ اس لیے کہ نیچے والے ہاتھ سے اوپر والا ہاتھ ہر حال میں اچھا ہوتا ہے اور اگر خدانخواستہ اس کے دل کے کسی گوشہ میں یہ خیال پرورش پا رہا ہو کہ لینے والوں سے اس کی حالت کہاں بہتر ہے؟ تو اسے اس کا چنداں غم نہ ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ آج اس کے پاس جو قدرے زائد سرمایہ ہے۔ اگر اس کو وہ دوسروں پر خرچ کر رہا ہے، تو خدانخواستہ کل اگر اس کے پاس نہ رہا تو وہ محروم بھی نہ ہوگا۔ اس لیے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''جو دولت مند ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں (اس کے ذریعہ) خدا ان کی دولت کو پاک وصاف فرمائیں گے اور جو نادار ہیں (اپنی ناداری کے باوجود) اگر انہوں نے فراخدلی سے خیرات کی تو اللہ انہیں اس سے کہیں زیادہ دے گا، جتنا آج انہوں نے خرچ کیا ہے۔'' امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک صدقۂ فطر اسی صورت میں آ سکتا ہے جب کہ آدمی مقررہ نصاب کا مالک ہو۔ بصورت دیگر اس پر صدقۂ فطر واجب نہ ہوگا۔

(ج) صدقۂ فطر ہر شخص تنہا اپنی طرف سے ہی نہ دے گا، بلکہ اپنی اولاد اور اپنے گھر کے تمام افراد کی طرف سے دے گا، جن کی پرورش اور سرپرستی اس کے ذمے ہے۔

(د) شریعت نے اس کی مقدار اس قدر کم رکھی ہے، جسے ملتِ اسلامیہ کی بڑی اکثریت

بلا فکر وتردد بآسانی ادا کرسکتی ہے، بلکہ ادا کرتی ہے۔ چنانچہ حسب ارشاد نبوی صدقۂ فطر کی مقدار ایک صاع گیہوں، کشمش یا کھجور ہے۔ یہ مقدار اس لیے رکھی گئی کہ عام طور پر ایک آدمی کی روزمرہ کی خوراک کم وبیش اسی قدر ہوتی ہے۔

صاع= چار لپ (متوسط ہاتھوں کے) میٹرک پیمانے سے صاع کی احتیاطی مقدار (۲.۱۶۷) سوا دو کلوگرام گیہوں ہے...... حضرت عمر بن عبدالعزیز، حسن بصری اور عطاء بن رباح رحمۃ اللہ علیہم سے منقول ہے کہ غلہ کی بجائے قیمت دینا بھی درست ہے، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بھی یہی کہتے ہیں، غالباً اس لیے کہ غریبوں کی حاجت براری کے لیے یہی بہتر ہے۔

بہرکیف! زکوٰۃ کا موضوع بے حد وسیع موضوع ہے، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، شائقین اس کے لیے ہماری کتاب ''فقہ الزکوٰۃ'' کا مطالعہ کرسکتے ہیں، اللہ کا شکر ہے کہ اس کے اندر کتاب وسنت کی روشنی میں زکوٰۃ کے فضائل و مسائل تفصیل سے درج ہیں، البتہ میں مناسب سمجھوں گا کہ زکوٰۃ کے کچھ گوشے یہاں اجاگر کروں، جو غریبی اور اس کے ازالہ سے متعلق ہیں، مثلاً: یہ کہ زکوٰۃ کا مقام، اس کی حکمت ومصلحت اور اس کے مقاصد کیا ہیں، یہ کب اور کن چیزوں پر واجب ہوتی ہے، اس کی جمع وتقسیم کے ذمہ دار اور اس کے مستحق کون ہیں، زکوٰۃ اور ٹیکس میں کیا فرق ہے؟ وغیرہ۔

اسلام میں زکوٰۃ کا مقام

یہ اس دین کا اعجاز، اس کے دین الٰہی اور ابدی پیغام ہونے کی دلیل ہے کہ اس نے غریبی کے علاج اور غریبوں کے حقوق کی بحالی کے لیے پہل کی، لیکن اس طرح نہیں کہ غریبوں کے سامنے حقوق اور مطالبات کی فہرست پیش کی، یا انہیں کسی خونیں انقلاب کے لیے استعمال کیا، بلکہ اس کی بجائے ایسی مثبت تدابیر کی طرف رہنمائی کی، جن سے کسی سیاسی اتھل پتھل اور ہنگامے کے بغیر صحیح معنی میں غریبی کا ازالہ ہو، اور کسی کا بال بیکا نہ ہو۔

منجملہ ان تدابیر کے ایک تدبیر زکوٰۃ ہے، جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے حکومتِ وقت (یا متحد مسلم سماج) کی زیر نگرانی ساری امت کی دولت میں فقیروں اور مسکینوں کی

رعایت کا حکم دیا اور اسے دین کا تیسرا رکن، اسلام کا مخصوص شعار اور چوتھی اہم ترین عبادت قرار دیا۔

زکوٰۃ کی اہمیت

قرآن پاک میں بارہا نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا ذکر کیا گیا ہے، چنانچہ: ﴿اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ سے پورا قرآن بھرا ہوا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کو اسلام کے بنیادی ارکان میں شمار فرمایا ہے۔ بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ: شَهَادَةِ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاءِ الزَّكٰوةِ وَصَوْمِ رَمَضَانَ وَحَجِّ الْبَيْتِ لِمَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا)) [1]

''اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے، کلمہ طیبہ کا اقرار، نمازوں کی پابندی، زکوٰۃ کی ادائیگی، حج کرنا، اور رمضان کے روزے رکھنا۔''

قرآن پاک اس کی تعلیم دیتا ہے کہ شرک سے بچتے ہوئے نماز پڑھنا اور زکوٰۃ دینا اسلامی برادری میں شرکت کی نشانی اور مسلمانوں کی سب سے بڑی پہچان ہے۔ چنانچہ لڑنے والے مشرکین کے بارے میں ارشاد ہوا:

﴿فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (۹/ التوبہ:۵)

''توبہ کرلیں اور نماز اور زکوٰۃ کو پابندی سے ادا کرنے لگیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو، اب وہ تمہارے بھائی ہوئے، بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا بڑی

[1] بخاری، کتاب الایمان، باب دعاء کم إیمانکم، رقم: ۸؛ مسلم، کتاب الایمان، باب بیان أرکان الاسلام ودعائمه العظام، رقم: ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳؛ ترمذی، کتاب الایمان، باب ما جاء بنی الاسلام علی خمس، رقم: ۲۶۰۹؛ نسائی، کتاب الإیمان، باب علی کم بنی الإسلام، رقم: ۵۰۰۴؛ مسند احمد: ۲/ ۲۶، رقم: ۴۷۸۳۔

مہربانی کرنے والا ہے۔"

﴿ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ﴾ ❶

"اور زکوٰۃ دیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں۔"

معلوم ہوا کہ زکوٰۃ وہ عبادت ہے جس کی ادائیگی کے بغیر نہ کوئی مسلمان بن سکتا ہے اور نہ اس عظیم تر اسلامی برادری میں شامل ہوسکتا ہے، جہاں ہر چھوٹے بڑے کو یہ حقوق حاصل ہوتے ہیں جو دوسروں کو حاصل ہوتے ہیں۔ جہاں خود ان سے بھی انہیں تمام حقوق کا مطالبہ کیا جاتا ہے جس کا مطالبہ اوروں سے کیا جاتا ہے۔

قرآنِ پاک نے نماز اور زکوٰۃ کو اسی لیے بارہا یکجا ذکر کیا، تاکہ دونوں کا باہمی تعلق نمایاں ہو اور ہر کوئی یہ جان لے کہ اسلام کی تکمیل دونوں کی یکجا ادائیگی میں مضمر ہے۔ چنانچہ جس طرح نماز دین کا ستون ہے۔ اس کی پابندی کرنے والا دین کی بنیادیں استوار کرنے والا سمجھا جاتا ہے اور اس کو چھوڑنے والا دین کو ڈھانے والا متصور ہوتا ہے، بالکل اسی طرح یہ بھی بتا دینا مقصود ہے کہ زکوٰۃ اسلام کا پل ہے، جو جہنم کے دونوں سروں پر بچھا ہوا ہے، جو اس پر سے صحیح وسالم گزرا وہ ہلاکت سے محفوظ ہوگا، لیکن جو غلط راستہ اپنائے گا جہنم اسے نگل لے گی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: "تمہیں نماز کی پابندی اور زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم ہے، لہٰذا ان کی پابندی کرو، اس لیے کہ جو زکوٰۃ نہ دے اس کی نماز نہ ہوگی۔" ❷

حضرت جابر رضی اللہ عنہ حضرت زید رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ نماز اور زکوٰۃ یکساں فرض ہے۔ ارشاد ہے:

﴿ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ﴾ ❸

"اگر انہوں نے توبہ کی، نمازوں کی پابندی کی اور زکوٰۃ ادا کی تو تمہارے دینی بھائی ہیں۔"

---

❶ ۹/ التوبہ:۱۱۔ ❷ تفسیر طبری، ج۱ ص۱۵۳۔
❸ ۹/ التوبۃ:۱۱۔

زکوٰۃ کی ادائیگی کے بغیر محض نمازیں ادا کرنے کو باری تعالیٰ بھی قبول نہیں کرتا۔
نیز کہتے تھے۔ (ابوبکر رضی اللہ عنہ) پر خدا رحمت کرے، وہ دین کے اسرار سے کس درجہ واقف تھے، جب انہوں نے کہا تھا:

وَاللّٰهِ لَأُقَاتِلَنَّ مَنْ فَرَّقَ بَيْنَ الصَّلٰوةِ وَالزَّكَاةِ [1]

''جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا، میں اس سے ضرور جنگ کروں گا۔''

قرآنِ کریم کی نظر میں زکوٰۃ دینا مسلمانوں کی امتیازی شان اور حق پرستوں اور نیکوکاروں کا خاص شعار ہے، جبکہ زکوٰۃ نہ دینا مشرکوں اور منافقوں کا شیوہ ہے، زکوٰۃ ایمان کی کسوٹی اور اخلاص وصداقت کی نشانی ہے، چنانچہ صحیح روایت میں ہے کہ ''صدقہ روشن دلیل ہے'' کفر اور اسلام، نفاق اور ایمان، بدکاری اور پرہیز گاری کے درمیان فیصلہ کن چیز ہے۔ زکوٰۃ نہ دینے والا اسلام سے خارج، کامیابی اور جنت الفردوس کی ضمانت سے محروم ہوتا ہے:

﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُونَ ۝﴾

(۲۳/ المؤمنون:۱ تا ٤)

''مومن کامیاب ہوئے، جو ڈر اور خوف کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں، لایعنی اور نکمی باتوں کی طرف مطلق توجہ نہیں دیتے اور زکوٰۃ ادا کرتے رہتے ہیں۔''

﴿هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِينَ ۝ الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ﴾ (۲۷/ النمل: ۲، ۳)

''ایمان والوں کے لیے موجبِ ہدایت وخوشخبری ہے جو نماز کی پابندی

---

[1] بخاری، کتاب الزکاۃ، باب وجوب الزکاۃ، رقم: ۱٤۰۰؛ مسلم، کتاب الایمان، باب الأمر بقتال الناس حتی یقولو لا اله الا الله، رقم: ۱۲٤؛ ابوداود، کتاب الزکاۃ، باب وجوب الزکاۃ، رقم: ۱۵۵٦؛ ترمذی، کتاب الایمان، باب ماجاء أمرت أن أقاتل الناس حتی یقولوا لا اله الا الله، رقم: ۲٦۰۷؛ نسائی، کتاب الزکاۃ، باب مانع الزکاۃ، رقم: ۳٤٤۵۔

کرتے ہیں، زکوۃ دیتے اور آخرت پر پورا یقین رکھتے ہیں۔"

زکوۃ نہ دینے والا کتاب اللہ کی ہدایت سے دور اور نیکو کاروں کے زمرے سے خارج ہو جاتا ہے:

﴿ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ ﴾ (۳۱/ لقمان:۳، ٤)

"نیک کام کرنے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہیں، جو نماز پڑھتے اور زکوۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں"

زکوۃ دیے بغیر آدمی کا شمار متقی پرہیزگار اور پاکباز بندوں میں نہیں ہوتا۔

﴿ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ...... هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝ ﴾ (۲/ البقرة:۱۷۷)

"یہ کوئی کمال نہیں کہ تم مشرق کی طرف رخ کر دیا مغرب کی طرف، بلکہ کمال یہ ہے کہ اللہ اور آخرت کے دن پر کامل ایمان رکھے، نبیوں، فرشتوں اور جملہ آسمانی کتابوں پر ایمان لائے اور اللہ کی محبت میں اپنی دولت کو رشتہ داروں، غریبوں اور تہی دست مسافروں پر خرچ کرے۔ اسی طرح نمازوں کی پابندی کرے، زکوۃ دے (اور خوب سمجھ لے کہ انہیں کاموں سے اللہ کے یہاں اس کی عزت ہوگی) اور وہ اس کے مخلص بندوں میں شامل ہوگا۔"

زکوۃ نہ دینے والوں اور مشرکوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہوتا۔

چنانچہ ارشاد ہے:

﴿ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ

کٰفِرُوْنَ﴾ (۴۱/ فصلت:۶، ۷)

''برا ہو مشرکوں کا، یہ نہ زکوٰۃ دیتے ہیں نہ ہی آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔''

زکوٰۃ میں لاپرواہی منافقوں کا شیوہ ہے:

﴿يَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ﴾ (۹/ التوبہ:۶۷) ''اپنے ہاتھوں کو بند رکھتے ہیں۔''

﴿وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ﴾ (۹/ التوبہ:۵۴)

''خرچ کرتے ہیں تو ناخوشی سے خرچ کرتے ہیں''

درحقیقت یہی لوگ رحمت خداوندی سے کوسوں دور رہتے ہیں۔

﴿وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۭ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ﴾ (۷/ الاعراف:۱۵۶)

''یوں تو میری رحمت سب کے لیے ہے، لیکن اس کے خصوصی حقدار وہ لوگ ہیں، جو اللہ سے ڈرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور ہماری آیتوں پر کامل یقین رکھتے ہیں۔''

﴿وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۗءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ (۹/ التوبہ:۷۱)

''اور مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں، نیک باتوں کی تعلیم دیتے ہیں اور بری باتوں سے منع کرتے ہیں اور نماز کی پابندی رکھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کا کہنا مانتے ہیں، ان لوگوں پر ضرور اللہ رحمت کرے گا، بلاشبہ اللہ تعالیٰ قادر، حکمت والا ہے۔''

زکوٰۃ میں لاپرواہی کرنے والوں کو اللہ، اس کے رسول اور اللہ کے نیک بندے

دوست نہیں رکھتے۔

﴿ إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ ﴾ (٥/ المآئدة:٥٥)

"تمہارے دوست، اللہ، اس کے رسول اور ایمان والے، جو نماز اور زکوٰۃ کی اس طرح پابندی کرتے ہیں کہ ان کے دل خوف خدا سے معمور ہوتے ہیں، اور بس اللہ کے لیے رکوع کرتے ہیں۔"

زکوٰۃ نہ دینے والے غیبی امداد سے بھی محروم ہوتے ہیں: اس لیے کہ

﴿ وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ۝ الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ ۗ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ۝ ﴾ (٢٢/ الحج: ٤٠، ٤١)

"اللہ تعالیٰ کی تائید اور غیبی امداد انہیں حاصل ہوتی ہے جو اس کے دین کی مدد کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو حکومت اور مرتبہ پانے کے باوجود نمازوں کی پابندی کرتے ہیں دوسروں کو اچھے کاموں کی ترغیب دیتے ہیں، برے کاموں سے منع کرتے ہیں۔"

زکوٰۃ نہ دینے پر عذاب

قرآن پاک جہاں زکوٰۃ دینے والوں کے لیے خیر و برکت اور اجر و ثواب کا وعدہ کرتا ہے، وہیں غریبوں کی حق تلفی کرنے والوں اور اپنی تجوریاں بھرنے والوں کے لیے ہولناک اور سخت ترین وعیدوں کا اعلان بھی کرتا ہے۔

چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ ۖ هَٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنفُسِكُمْ فَذُوقُوا

مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ﴾ (۹/ التوبه:۳٤، ۳۵)

"اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، آپ انہیں دردناک عذاب کی خبر دیجئے۔ اس روز سونے اور چاندی کو آگ سے تپایا جائے گا، پھر اس سے ان کی پیشانی، پہلو اور پشتوں کو داغا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا یہ وہی سونا اور چاندی ہے جسے تم اپنے لیے جوڑ جوڑ کر رکھتے تھے، اب مزہ چکھو اپنے جمع کرنے کا۔"

اسی طرح زکوٰۃ نہ دینے والوں کو رسول اللہ ﷺ نے بڑی وعید سنائی ہے اور دنیا میں برے انجام اور آخرت میں برے حشر سے خبردار کیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ اٰتَاهُ اللّٰهُ مَا لًا فَلَمْ يُؤَدِّ زَكٰوتَهُ مُثِّلَ لَهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ شُجَاعًا أَقْرَعَ لَهُ زَبِيْبَتَانِ يُطَوَّقُهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ثُمَّ يَأْخُذُ بِلِهْزِمَتَيْهِ يَعْنِيْ بِشِدْقَيْهِ ثُمَّ يَقُوْلُ اَنَا مَالُكَ اَنَا كَنْزُكَ)) ثُمَّ تَلَا النَّبِيُّ ﷺ ﴿وَلَا يَحْسَبَنَّ﴾)) [1]

"جس کو اللہ نے مال دیا ہے اور اس نے اس کی زکوٰۃ نہ نکالی، اس کا مال قیامت کے دن ایک سانپ کی شکل میں لایا جائے گا جس کی دو زبانیں ہوں گی، وہ اس کی گردن میں ڈال دیا جائے گا، پھر یہ سانپ اس آدمی کو اپنے جبڑوں میں جکڑ لے گا اور کہے گا میں تیرا مال ہوں، میں تیرا خزانہ ہوں۔" پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ﴾

دنیا کی سزاؤں کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا:

[1] بخاری، کتاب الزکاۃ، باب اثم مانع الزکاۃ، رقم: ۱٤۰۳؛ مسلم، کتاب الزکاۃ، باب اثم مانع الزکاۃ، رقم: ۲۲۹٦؛ نسائی، کتاب الزکاۃ، باب مانع زکاۃ، رقم: ۲٤۵٦؛ ابن ماجه، ابواب الزکاۃ، باب فی منع الزکاۃ، رقم: ۱۷۸٤؛ دارمی، کتاب الزکاۃ، باب من لم یؤد زکاۃ الابل والبقر والغنم، رقم: ۱٦۱۷؛ مؤطا مالك، کتاب الزکاۃ، باب ما جاء فی الکنز، رقم: ۲۲۔

((مَا مَنَعَ قَوْمٌ الزَّكٰوةَ اِلَّا ابْتَلَاهُمُ اللّٰهُ بِالسِّنِيْنَ)) [1]

''جو قوم زکوٰۃ دینے سے کتراتی ہے۔ اللہ اسے قحط سالی اور بھوک وافلاس میں گرفتار کر دیتا ہے۔''

دوسری حدیث میں فرمایا:

((وَلَمْ يَمْنَعُوْا زَكٰوةَ اَمْوَالِهِمْ اِلَّا مُنِعُوا الْقَطْرَ مِنَ السَّمَآءِ وَلَوْلَا الْبَهَائِمُ لَمْ يُمْطَرُوْا)) [2]

''جب بھی وہ لوگ زکوٰۃ سے غفلت کریں گے بارانِ رحمت سے اللہ انہیں محروم کر دے گا اور اگر یہ بے زبان چوپائے اور مویشی ان کے پاس نہ ہوتے تو تم دیکھ لیتے کہ بارش کا ایک قطرہ بھی ان پر نہ گرتا۔''

ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

((وَمَا خَالَطَتِ الصَّدَقَةُ اَوْقَالَ الزَّكٰوةُ مَالاً اِلَّا اَفْسَدَتْهُ)) (بیہقی)

''صدقہ اور زکوٰۃ کا روپیہ جس مال سے خلط ملط ہو جاتا ہے، وہ مال ہلاک ہو جاتا ہے۔''

زکوٰۃ دبانے والوں کی یہ سزائیں تو وہ ہیں جو باری تعالیٰ کی طرف سے دنیا یا آخرت میں ظہور پذیر ہوتی ہیں، یا ہوں گی، لیکن اس کے علاوہ اس جرم کی کچھ اور سزائیں بھی ہیں جسے اسلامی شریعت نے وضع کیا ہے اور حاکم وقت یا امت کے سربراہ کو اس کے نفاذ کی اجازت دی ہے۔ چنانچہ اس حدیث کو لیجیے:

((مَنْ اَعْطَاهَا مُؤْتَجِراً فَلَهُ اَجْرُهَا وَمَنْ مَنَعَهَا فَاِنَّا اٰخِذُوْهَا وَشَطْرَ اِبِلِهٖ عَزْمَةً مِّنْ عَزَمَاتِ رَبِّنَا لَا يَحِلُّ لِاٰلِ مُحَمَّدٍ مِنْهَا شَيْءٌ.)) [3]

''زکوٰۃ دینے والا کبھی بھی اجر سے محروم نہ ہوگا، لیکن یاد رکھو! جو زکوٰۃ نہ دے

---

[1] معجم الطبرانی الأوسط: ج ٥/ ص: ٢٩٠، رقم: ٤٥٧٤۔ [2] ابن ماجه، کتاب الفتن، باب العقوبات، رقم: ٤٠١٩۔ [3] نسائی، کتاب الزکاة، باب سقوط الزکوٰة عن الإبل إذا کانت رسلا لأهلها ولحمولتهم، رقم: ٢٤٥١؛ مسند احمد: ٥/ ٢، رقم: ١٩٥١٤ و ایضا، رقم: ١٩٥٣٤۔

گا، میں اسے گرفتار کرلوں گا، اور اس کی جائیداد کا نصف حصہ بحق باری تعالیٰ ضبط کرلوں گا، لیکن مجھے یا آلِ محمد کو اس میں سے ایک پائی بھی نہ ملے گی۔''

اس حدیث سے اس بات کی کھلی اجازت ملتی ہے کہ حاکم وقت ایسوں کی جائیداد تک ضبط کرسکتا ہے، تاکہ زکوٰۃ چوروں یا اس کی ادائیگی میں سستی کرنے والوں کی آنکھیں کھلیں اور وہ مزید غفلت سے باز آئیں۔

لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس سلسلے کی تمام سزائیں تعزیر میں شمار ہوں گی اور یہ قاعدہ ہے کہ تعزیر کا تعین بڑی حد تک حاکم وقت یا سربراہ مملکت کی صوابدید اور موقعہ اور محل کی مناسبت پر موقوف ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جائیداد کی ضبطی کی بجائے قید و بند، یا جسمانی اذیت کی دوسری متبادل صورت پر بھی عمل کیا جا سکتا ہے اور اگر مذکورہ بالا سزائیں بھی اثر انداز نہ ہوسکیں تو حاکم یا سربراہ کو اس کی بھی مکمل اجازت ہوگی کہ ایسوں کے خلاف تلوار اٹھائے اور انہیں تہ تیغ کرادے۔

جیسا کہ خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانے میں کیا تھا۔ آپ نے فرمایا: وَاللّٰہِ لَأُ قَاتِلَنَّ۔ اللہ کی قسم میں اس سے جنگ کروں گا، جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا، اس لیے کہ زکوٰۃ مال کا حق ہے، خدا کی قسم اگر وہ ایک رسی بھی جو وہ حضور کو دیتے تھے اب اس سے انکار کریں گے تو میں ان سے لڑوں گا۔ [1]

علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ

''زکوٰۃ روک لینے والوں کے بارے میں شرعی فیصلہ یہ ہے کہ زبردستی یا بخوشی، بہرصورت ان سے زکوٰۃ کا مطالبہ کیا جائے، البتہ جو انکار نہیں کرتے، مگر دینے کی بجائے دبانے کی تدبیر کرتے ہیں، ایسے افراد گناہگار سمجھے جائیں گے اور انہیں وقتاً فوقتاً تنبیہ بھی کی

---

[1] بخاری، کتاب الزکاۃ، باب وجوب الزکاۃ، رقم: ۱۴۰۰؛ مسلم، کتاب الایمان، باب الأمر بقتال الناس حتی یقولوا لا الہ الا اللہ، رقم: ۱۲۴؛ ابو داود، کتاب الزکاۃ، باب وجوب الزکاۃ، رقم: ۱۵۵۶؛ ترمذی، کتاب الایمان، باب ما جاء أمرت أن أقاتل النّاس حتی یقولوا لا الہ الا اللہ، رقم: ۲۶۰۷؛ نسائی، کتاب الزکاۃ، باب ما جاء فی مانع الزکاۃ، رقم: ۲۴۴۵۔

جائے گی، تاکہ مطلوبہ رقم کی ادائیگی پر رضامند ہو جائیں، ورنہ بصورت دیگران کی سزا بحال رکھی جائے گی۔ خواہ اس اثنا میں ان کے جسم اور جان کا رشتہ ہی کیوں نہ ٹوٹ جائے۔ اس لیے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''جب تم کسی کو کوئی برائی کرتے ہوئے دیکھو اور اسے روکنے کی صلاحیت اپنے اندر پاؤ تو طاقت اور زور کے بل پر اس کو روک دو......'' ظاہر ہے زکوٰۃ دبانا انتہا درجے کی برائی ہے۔ لہٰذا با اثر کو چاہیے کہ اسے بزور رفع کرے۔ [1]

زکوٰۃ عقل کی روشنی میں

اب تک پیش کی گئی صراحتوں سے زکوٰۃ کی فرضیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ فریضہ اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں نہایت اہم اور ممتاز مقام رکھتا ہے جن پر اسلام کی عمارت قائم ہے اور نسل در نسل تمام مسلمان اس کی افادیت، اس کی فرضیت پر متفق ہیں۔

کتاب وسنت اور اجماع امت کی طرح عقل وبصیرت بھی زکوٰۃ کی فرضیت کو من وعن تسلیم کرتی ہے۔ چنانچہ بدائع ج ۲ ص ۳ میں ہے:

① زکوٰۃ دینے کی وجہ سے سب سے پہلے دینے والے کے نفس کی اصلاح ہوتی ہے اور وہ ہر قسم کے گناہوں کی آلودگی سے بچ جاتا ہے۔ اس لیے کہ نفس اور لالچ کے درمیان گہرا تعلق ہوتا ہے اور لالچ بدترین خصلت ہے۔ چنانچہ لالچی اور حریص کا دل مرتے مرتے مال میں اٹکا ہوتا ہے اور بالآخر دنیا وآخرت کی رسوائی اس کا مقدر بن جاتی ہے، لیکن اس کے بالمقابل اگر کوئی زکوٰۃ نکالنے کا عادی بن جائے تو اس کا نفس لالچ سے پاک ہو جاتا ہے اور اس کے اندر خدا اور بندوں سے تعلق، ان کے حقوق کی ادائیگی اور اونچے اخلاق اور پرہیزگاری جیسی بے بہا خصلتیں پیدا ہوتی ہیں۔ نیز ارشاد ہے: ﴿ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً ﴾ (۹/التوبہ:۱۰۳)

② دوسری دلیل یہ ہے کہ زکوٰۃ کے ذریعے غریبوں، اپاہجوں، کمزوروں اور ناداروں

[1] المحلی لابن حزم، المسئلة مانع الزكاة، ج۱۱، ص: ۳۱۳، رقم: ۲۲۵۷۔

کی اعانت ہوتی ہے، ناتوانوں کو توانائی اور بے آسوں کو آس ہوتی ہے اور وہ خدا کی بندگی اور اپنی زندگی کی اصلاح و درستی کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ پھر چونکہ دوسروں کی اصلاح بھی اہم فریضہ ہے اور اس فریضہ کی تکمیل اور تشکیل زکوٰۃ کے ذریعہ ہوتی ہے۔ اس لیے زکوٰۃ خود ایک اہم فرض بن جاتی ہے۔

③ تیسری دلیل یہ ہے کہ دولت اور ثروت خداوند کریم کی زبردست نعمت ہے اور عقل کا تقاضا ہے کہ نعمت کی قدر کی جائے۔ بس پھر اس کا شکریہ ادا کیا جائے اور شکریہ ادا کرنے کی سب سے بہتر شکل یہ ہوتی ہے کہ اپنی ضروریات سے جس قدر زائد ہو، اس کو ایسوں پر خرچ کیا جائے جو بڑی حد تک اس نعمت سے محروم ہیں۔

یہ اور اس قسم کی متعدد دلیلوں اور وجوہات کا اثر ہے کہ علما یک زبان ہو کر کہتے ہیں کہ زکوٰۃ کا منکر کافر اور دائرہ اسلام سے اس طرح خارج ہو جاتا ہے، جیسے تیر کمان سے نکل جاتا ہے۔ علامہ ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''زکوٰۃ سے انکار کا سبب اگر جہالت ہو اور انکار کرنے والا جاہل تسلیم کیے جانے کے لائق ہو، مثلاً: وہ نومسلم، ان پڑھ دیہاتی ہو تو ایسے شخص کو فوراً کافر نہ کہا جائے گا بلکہ مناسب طریقے پر اس کی فہمائش کی جائے گی، لیکن اگر وہ دینی ماحول میں پلا بڑھا ہو تب بھی اسے تین مرتبہ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے توبہ کے لیے موقع دیا جائے گا ورنہ آخر تک انکار کرنے کی صورت میں قتل کر دیا جائے گا۔ [1]

زکوٰۃ ایک مطالبہ

جیسا کہ عرض کیا گیا اسلامی نقطۂ نظر سے مالداروں کے مال میں غریبوں کا حق ہے، اسی حق کا نام زکوٰۃ ہے۔ یہ حق اور اس کی مقدار نامعلوم اور مبہم نہیں، بلکہ لینے والے اور دینے والے ہر دو فریق اسے بخوبی جانتے ہیں اور خود باری تعالیٰ نے اس کو حق قرار دیا ہے اور اس کی مقدار متعین فرمائی ہے، چنانچہ اپنے نیکوکار بندوں کے بارے میں اس کا ارشاد ہے:

[1] المغنی، کتاب الزکاۃ، فصل فمن أنکر وجوبها جهلا به، ج ۲ ص: ۵۷۳۔

﴿ وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ﴾ (۵۱/ الذاریات:۱۹)

’’اوران کے مال میں مانگنےاور نہ مانگنے والے دونوں کا حق ہے۔‘‘

اس کے کچھ بندے وہ ہوں گے، جو اس کی جانب سے جنت میں اکرام کے مستحق ہوں گے۔ان کے بارے میں ارشاد ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ ﴾

(۷۰/ المعارج:۲۴، ۲۵)

’’اور جن کے مال میں حصہ مقرر ہے، مانگنے والے کا اور نہ مانگنے والے کا۔‘‘

اسی اہمیت کا نتیجہ ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک زکوٰۃ کا حق مال کے اندر متعین ہو جاتا ہے، اور اگر مالدار زکوٰۃ ادا نہ کرے اور سال گزر جائے تو بقدر زکوٰۃ مال جو دراصل فقیر کا حق تھا، اس شخص کے سرمائے میں شامل مانا جائے گا، اور فقیر بطور حصہ دار اس کا شریک رہے گا، اب اگر مالک کل مال کا لین دین یا اس کا سودا کرے گا تو یہ سودا اس کے مال میں جاری نہ ہوگا، جو بقدر زکوٰۃ اس کے مال میں ضم ہے اور اگر فقیر مر جائے گا تو اس کے اہل وعیال اس مال کے وارث ہوں گے، اس لیے کہ زکوٰۃ کی جس قدر مقدار اس کے مال میں مل چکی تھی وہ دراصل فقیر کا حق تھا وہ شخص اس کا مالک نہ ہوگا۔ اسلامی نقطۂ نظر سے دولت، ملکیت اور اس کی حیثیت کا علم ہو جانے کے بعد زکوٰۃ کے حق ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی، اس لیے کہ شرعی طور پر یہ امر مسلم ہے کہ وہ تمام اشیا جسے انسان اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ان سب کی نسبت صرف اسی کی طرف کرنی چاہیے جو ان کا خالق بھی ہے اور مالک حقیقی بھی، جبکہ انسان صرف ایک چیز کا ذمہ دار ہے اور یہ چیز منصب خلافت اور نیابت ہے۔

چنانچہ ارشاد ہے:

﴿ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ﴾ (۵۷/ الحدید:۷)

’’اور جس مال میں اس نے تم کو جانشین بنایا اس میں سے خرچ کرو۔‘‘

یہ اور دوسری آیتیں کھلم کھلا اس بات کا اعلان کرتی ہیں کہ دولت کسی کی جاگیر

نہیں، بلکہ اس کے اصل مالک نے انسانوں کو اس کا امین اور نگران ٹھہرایا ہے۔ اب یہ انسان کا فرض ہے کہ اس خالق و مالک کے احکام اور اس کے بتلائے ہوئے حقوق کی رعایت کرے اور انہیں ادا کرنے کی فکر کرے۔

زکوٰۃ ایک قرض

زکوٰۃ کے سلسلے میں بیان کی گئی انہی خصوصیات اور افادیت کے پیش نظر شریعت کا یہ اٹل فیصلہ ہے کہ زکوٰۃ ایک قرض ہے اور کوئی شخص بھی جب تک اپنے ذمہ کی زکوٰۃ ادا نہ کرے گا، نہ اسے چھٹکارا ملے گا، نہ ہی زکوٰۃ اس سے ساقط ہوگی، خواہ اس طرح ایک طویل عرصہ نہ گزر جائے۔ چنانچہ علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''جس نے ایک سال کی یا اس سے زیادہ کی زکوٰۃ نہ دی، خواہ اس لیے کہ اسے ادائیگی کا صحیح علم یا طریقہ معلوم نہ تھا یا اس لیے کہ بیت المال کا کارندہ وصولی کے لیے اس تک نہ پہنچ سکا یا وہ زکوٰۃ ہی دبا لینا چاہتا تھا، اسی طرح زکوٰۃ خواہ نقد روپوں کی تھی یا پیداوار یا مویشیوں کی، ہر حال میں اس شخص کو چاہیے کہ ہر چیز کا حساب لگا کر ان کی پائی پائی زکوٰۃ اپنی زندگی میں ادا کر دے اور اس کے بعد کہیں دوسرے قرضوں کی فکر کرے۔ اس لیے کہ زکوٰۃ خود زبردست قرض کی حیثیت رکھتا ہے۔'' [1]

''دوسرے قرضوں کے مقابلے میں زکوٰۃ کے قرضے کو اس لیے بھی نمایاں اور ممتاز مقام حاصل ہے کہ حکومتوں کا مقرر کردہ ٹیکس کسی قانونی موشگافی یا لمبے عرصے تک عدم ادائیگی کے تحت ساقط الاعتبار ہوسکتا ہے، لیکن اس کے مقابلے میں زکوٰۃ کا قرضہ ان دو میں سے کسی ایک کے ذریعہ بھی ختم نہیں کیا جا سکتا بلکہ فرد کے دین و ایمان اور اس کے عقیدے کی سلامتی کا زبردست پیمانہ اور نشان قرار پاتا ہے۔ اس لیے کہ زکوٰۃ، خدا، بندگانِ خدا، خصوصاً فقیروں کا حق ہے۔

[1] محلی ابن حزم، کتاب الزکاة، المسئلة: ٦٨٦، حکم من اجتمع فی ماله زکاتان فصاعدًا وهو حی ودلیل ذالك واقوال الفقهاء فی ذالك وبیان حججهم، ج٦ ص: ٨٧۔

پھر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ و شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور متعدد ائمہ کا مسلک یہ بھی ہے کہ فرضیت زکوٰۃ کے بعد موت واقع ہونے کی صورت میں میت کے ترکے سے زکوٰۃ وصول کی جائے گی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن پاک میں ہے:

﴿مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ﴾ (٤/ النسآء:١٢)

''ترکہ کی تقسیم قرض کی ادائیگی اور وصیت پوری کرنے کے بعد عمل میں لائی جائے گی۔'' [1]

اور جیسا کہ ابن حزم کے حوالے سے بتایا گیا، زکوٰۃ بھی ایک قرض ہے جس کا مطالبہ کرنے والا باری تعالیٰ ہے، البتہ فقرا اور مساکین اس کی طرف سے زکوٰۃ کی رقمیں وصول کرتے ہیں۔

علاوہ ازیں علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے زکوٰۃ کے اسی امتیاز کے ثبوت میں صحیح مسلم کی یہ روایت پیش کی ہے کہ

جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: اِنَّ أُمِّيْ مَاتَتْ وَعَلَيْهَا صَوْمُ شَهْرٍ أَفَأَقْضِيهِ عَنْهَا؟ فَقَالَ: ((لَوْ كَانَ عَلَى أُمِّكَ دَيْنٌ أَكُنْتَ قَاضِيَهُ عَنْهَا)) قَالَ: نَعَمْ: قَالَ: ((فَدَيْنُ اللّٰهِ أَحَقُّ أَنْ يُقْضٰى)) [2]

رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک صاحب آئے اور عرض کیا، اے اللہ کے رسول! میری والدہ کا انتقال اس حال میں ہوا کہ ان کے ذمہ ایک ماہ کے روزے باقی رہ گئے۔ کیا میں روزے کے اس قرضے کو ادا کر سکتا ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیوں نہیں۔ اگر تمہاری والدہ مقروض ہوتیں تو کیا تم ان کا قرض ادا نہ کرتے۔'' انہوں نے عرض کیا ضرور کرتا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''پھر اللہ کے قرض کی ادائیگی اس سے کہیں زیادہ

[1] المغنی، کتاب الزکاۃ، فصل ولاتسقط الزکاۃ بموت رب المال، ج٢/ ٦٨٣۔

[2] مسلم، کتاب الصیام، باب جواز تأخیر قضاء رمضان مالم یجئ رمضان آخر، رقم٢٦٩٤؛ بخاری، کتاب الصیام، باب من مات وعلیه صوم، رقم: ١٩٥٣؛ ابن ماجه، کتاب الصیام، باب من مات وعلیه صیام من نذر، رقم: ١٧٥٩۔

مقدم ہے۔"

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ فرض ہو جانے کے بعد، لیکن ادا کرنے سے پہلے موت واقع ہونے کی صورت میں ادائیگی ساقط نہ ہوگی، بلکہ یہاں اتنا اضافہ کر لیجئے کہ خواہ یہ موت میدان جنگ میں لڑ کر شہید ہو جانے کی صورت میں کیوں نہ نصیب ہوئی ہو۔ اس لیے کہ مسلم نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((يُغْفَرُ لِلشَّهِيدِ كُلُّ ذَنْبٍ إِلَّا الدَّيْنَ)) [1]

"قرض کے سوا شہید کے سارے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔"

اور یہ صحیح ہے کہ علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر علما نے زکوٰۃ کو ان قرضوں میں شمار کیا ہے، جو کبھی معاف نہ ہوں گے۔ (منار السبیل ج ۲ ص ۲۸۵) درحقیقت زکوٰۃ اسلام کا ایسا بنیادی رکن ہے جو طویل عرصہ گزرنے یا موت واقع ہونے سے بھی ساقط نہیں ہوتا، بلکہ دوسرے قرضوں کے مقابلے میں اسے انتہائی اہمیت اور امتیاز بھی حاصل ہے۔ چنانچہ ٹیکس کی وصولیابی کا موجودہ طریقہ اس معنی میں اسلام کی پیروی کرتا ہے، کہ قرض خواہوں کی قطار لگ جانے کی صورت میں حکومت اپنا قرض پہلے وصول کرتی ہے اور ٹال مٹول کی صورت میں سخت کارروائی کرتی ہے۔

زکوٰۃ کی روح

غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ زکوٰۃ کی روح یہ ہے کہ دولت پا کر کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ تنہا اس کی اپنی ملکیت ہے، بلکہ یہ خدا کا فضل ہے جس کے لیے اسے منتخب کیا گیا ہے۔ پھر اس میں شک نہیں کہ اس حقیقت کو بطور عقیدہ منوا لینے کے بعد اور زکوٰۃ کو فرض قرار دے کر اسلام نے غریبوں اور مالداروں کے درمیان ایسا توازن قائم کیا، جو صرف قانون الٰہی اور آئین فطرت ہی انجام دے سکتا ہے، چنانچہ جیسا کہ عرض کیا گیا، خود حق تعالیٰ نے دولت

[1] ابن ماجہ، کتاب الجهاد، باب فضل غزو البحر، رقم: ۲۷۷۸؛ مسند احمد: ۲/ ۲۲۰، رقم: ۷۰۱۱؛ مسلم، كتاب الامارة، باب من قتل فی سبیل الله كفرت خطایاہُ إلّا الدین، رقم ٤٨٨٤۔

اور ملکیت کی حدود اور قیود متعین کیں اور بندوں کو ان کی پابندی کا حکم دیا۔

بہر کیف اب ایک طرف زکوٰۃ کی اسی روح اور اسپرٹ کو لیجیے جو اسلام کی اپنی پیدا کردہ ہے اور جس سے وہ غریبی کا ازالہ کرنا چاہتا ہے اور دوسری طرف سوشلزم یا اس کی آخری حد مارکسسٹ کمیونزم کو لیجیے، جس نے ''غریبی ہٹاؤ'' کا بلند بانگ دعویٰ اپنا کر غریبوں کی خیر خواہی اور ان کے حقوق کے نام سے شور و غل مچایا اور اس کے لیے طریق کار بھی کچھ اس قسم کا اپنایا جو عقل و بصیرت کی بجائے جذبات کو اپیل کرے۔ چنانچہ انہوں نے غریبوں سے کہا..... تمہارے یہاں چوری ہوئی اور چور یہ سرمایہ دار ہیں! اس قسم کے ہیجان انگیز نعروں سے انہوں نے غریبوں کے دلوں میں نفرت اور طبقہ واریت کی آگ لگائی۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ نہ غریبوں کے یہاں چوریاں ہوئیں، نہ ہی سرمایہ دار چور ہیں اور نہ غریبوں کی غریبی میں سرمایہ داروں کا ہاتھ ہے۔

علاوہ ازیں بقول ڈاکٹر ابراہیم سلام:

''سوشلسٹوں کے گروپ میں ہمیں ایک طبقہ ایسا بھی نظر آتا ہے، جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کے نظریات اسلامی اصولوں سے میل کھاتے ہیں جب کہ ان میں دوری ہے، مثلاً: وہ کہتے ہیں کہ ''غریبوں اور سرمایہ داروں کے درمیان ازل سے ایک معاہدہ ہوا ہے کہ ایک کی محنت ہوگی اور دوسرے کا سرمایہ ہوگا۔ چنانچہ اسی معاہدہ کے تحت غریب محنت کرتے رہے، لیکن اس کے باوجود وہ غریب سے غریب تر ہوتے رہے اور دوسری طرف سرمایہ دار غریبوں کا خون چوس کر ان کا استیصال کرتے رہے، تا آنکہ وہ وقت آیا جب کہ غریبوں نے سرمایہ داروں کی عیاری اور چالبازی کو بھانپ لیا اور ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، تاکہ ان مالداروں سے اپنا وہ بقایا وصول کریں جو عرصہ دراز سے ان کی محنت کی وجہ سے ان سرمایہ داروں کی تجوریوں میں جمع ہوتا رہا ہے۔'' (دین واخلاق)

آپ سوچیں گے کہ یہ درست ہے؟ لیکن میں بتاتا ہوں کہ یہ نظریہ غلط اور گمراہ کن ہے اور اس کا مقصد عام ہیجان اور بے چینی پھیلانے کے سوا کچھ نہیں، چنانچہ ہر کوئی

دیکھ سکتا ہے کہ یہ نظریہ ایک فرضی معاہدے سے شروع ہو کر عام لوٹ مار کی خفیہ تلقین پر ختم ہوتا ہے۔ جس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ ظلم اور بڑھے گا؟ اس کی بجائے دیکھیے کہ...... ایک مثبت صورت یعنی زکوٰۃ کے ذریعہ اسلام اشتراکیوں سے کہیں زیادہ پاکیزہ اور وسیع پیمانے پر غریبوں کی کفالت اور نگہداشت کس طرح کرتا ہے؟ (ایضاً)

① اسلام غریبوں کو مالداروں کی دولت میں حصہ دار ہی نہیں بلکہ حق دار بھی قرار دیتا ہے، لیکن یہ حق فرضی یا مجہول تصور نہیں کرتا، جیسا کہ دوسرے سمجھتے ہیں اور نہ اس حق کو کسی معاہدے کا نتیجہ تصور کرتا ہے، بلکہ اس کی مخصوص اور معقول مقدار مقرر کرتا ہے۔ چنانچہ اسلام میں زکوٰۃ ایسا فریضہ ہے جو ایک طرف اللہ کا حق ہے اور دوسری طرف بندوں کے حقوق میں شامل ہے۔ اس لیے اس معاملے میں کوتاہی کرنے والا خدا اور بندے دونوں کی حق تلفی کرنے والا تصور کیا جائے گا۔ پھر زکوٰۃ اللہ کا حق اس طرح ہے کہ وہی ہر چیز کی طرح مال و دولت کا بھی خالق و مالک اور رازق ہے اور ساری کائنات اسی کے تابع اور مسخر ہے اور اسی مالک حقیقی نے زکوٰۃ دینے کے لیے ایک سے زائد تاکیدی احکام دیئے۔ بندوں کا حق اس طرح ہے کہ بندے غربت اور افلاس کی وجہ سے اس کے مستحق ہوتے ہیں اور دینی رشتوں کی وجہ سے انہیں اس کے وصول کرنے کا حق پہنچتا ہے۔

غریبوں کے لیے کیوں؟

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کی بتائی ہوئی ان وجوہات کو پیش کیا جائے جن سے معلوم ہوگا کہ سرمایہ داروں کی دولت میں غریبوں کا حق کیونکر نکلتا ہے۔

پہلی وجہ: فطری بات ہے کہ جو کوئی اپنے روزمرہ کے اخراجات سے کچھ رقم بچا کر رکھتا ہے، باوجودیکہ اس سے کہیں زیادہ ضرورت دوسروں کو ہوتی ہے۔ مگر پھر بھی یہ حق تنہا اسے حاصل ہوتا ہے کہ وہ انہیں جہاں چاہے استعمال کرے یا نہ کرے، یہ اس لیے کہ روپیہ اسی کا ہے اور اس کے اپنے روپیہ پر اس سے زیادہ حق کس کو

حاصل ہو سکتا ہے؟ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک بے حد غریب اور فاقہ مست آدمی ایسے کسی مالدار کے دروازے پر کھڑا ہوتا ہے اور خود کو امداد و اعانت کا حق دار ثابت کرتے ہوئے اس بات کی پرزور درخواست کرتا ہے کہ مخاطب اس کی کسی طرح مدد کر دے۔ سوچیں تو معلوم ہوگا کہ مالدار کی ضرورت سے زائد رقم پر اس کے حق کے ساتھ ساتھ اس دوسرے کا کچھ نہ کچھ حق نکلتا ہے۔ مالک کا حق، جیسا کہ آپ جانتے ہیں اس طرح نکلتا ہے کہ اس نے اس کے حصول کے لیے انتھک کوششیں کیں اور انتہائی دانشمندی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی ضرورت کے لیے اسے بچا کر رکھا، لیکن اس غریب کا حق بھی اس لیے نکلتا ہے کہ وہ مصیبت زدہ اور بے حد پریشان ہے اور امداد کا سخت محتاج ہے۔ یہاں آپ یہ بھی تسلیم کریں گے کہ الگ الگ رجحان کے حامل ان دونوں افراد کو جب غلط آب و ہوا ملتی ہے، ان کے اندر نفرت پروان چڑھتی ہے اور پھر دنیا دو طبقوں میں بٹ جاتی ہے۔ ایک طرف وہی باشعور مالدار سرمایہ دار کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور دوسری طرف وہ فاقہ مست حقوق کی طویل فہرست لے کر سڑکوں اور چوراہوں پر نکل جاتا ہے اور پھر یہ اختلاف تصادم کی حد تک پہنچ کر پرسکون بستیوں کو ویران بنا دیتا ہے، لیکن آپ دیکھیں گے کہ ایسے ہر موقع پر اسلام ثالث بالخیر ہوتا ہے اور دونوں فریق کو صحیح مشورے دیتا ہے۔ چنانچہ اس موقعہ پر وہ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ محنت و تدبر اور نگرانی کی وجہ سے دولت پر ملکیت کا حق مالک کو پہنچتا ہے، لیکن غریبی اور افلاس کی وجہ سے اس دولت کی ایک مخصوص مقدار پر اس غریب کا بھی حق ہوتا ہے اور اس کا یہ حق اسے ملنا چاہیے۔

دوسری وجہ: یہ ہے کہ زائد رقم کو اگر کوئی گھر میں ڈال لے، یا تجوری میں بند کرے تو کسی کام نہ آئے گی اور یونہی پڑی رہے گی، لیکن جب اس دولت کا ایک حصہ تجوری سے نکل کر غریبوں کی بستی میں گردش کرنے لگے گا تو اگرچہ بظاہر اس دولت

مند کو دنیا میں کوئی فائدہ نہ پہنچے گا، لیکن اس گردش سے اس بستی والوں کو ضرور فائدہ پہنچے گا، ان کا کام بھی بن جائے گا اور خدا کے حکم پر اس کا عمل بھی ہو جائے گا اور کیا عجب کہ وقت آنے پر وہی غریب اس دنیا میں اس کے بھی کام آ جائے؟

تیسری وجہ: تیسری اور آخری وجہ یہ ہے کہ غریب اور مسکین خدا کا کنبہ ہیں (اَلْخَلْقُ عَيَالُ اللّٰهِ) اور مالدار اس کی دی ہوئی دولت کے نگراں...... اور یہ بڑی زیادتی ہے کہ جس کا روپیہ ہو، اسی کے اہل وعیال پر اسے خرچ نہ کیا جائے۔" [1]

چنانچہ مشہور حدیث قدسی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ "اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اپنے بندے سے کہیں گے۔ اے بنی آدم! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تو نے مجھے کھانا نہیں دیا؟ وہ کہے گا، میں کیسے آپ کو کھانا دیتا؟ آپ تو رب العالمین ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے تجھ کو خبر نہیں، میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا، تو نے اس کو کھانا نہیں دیا۔ اگر تو اس کو کھانا کھلاتا تو وہ میرے پاس پہنچتا!"

زکوٰۃ کی مقدار

② اسلام میں زکوٰۃ کی مقدار انتہائی عدل وانصاف پر مبنی ہے۔ اس میں ایک طرف سرمایہ دار کی محنت کی رعایت کی گئی ہے اور دوسری طرف غریب کی حاجت اور ضرورت کا لحاظ کیا گیا ہے۔ سرمایہ دار یہ شکایت نہیں کر سکتا کہ اس پر ناقابل برداشت بوجھ ڈال دیا گیا، نہ غریب یہ گلہ کر سکتا ہے کہ اس کی ضرورتوں کا خیال نہیں کیا گیا۔

چنانچہ علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"زکوٰۃ کب؟ کتنی؟ اور کن چیزوں پر واجب ہوتی ہے؟ اسی طرح کن لوگوں سے لے کر کن لوگوں کے حوالے کی جاتی ہے؟ ان سب امور سے متعلق تسلی بخش جوابات، حدیث وفقہ کی کتابوں میں موجود ہیں اور ان کی تفصیل وتحقیق میں پورا کتب خانہ تیار کیا جا چکا ہے۔ ان تفصیلات میں مالداروں اور غریبوں دونوں کی رعایت کی گئی ہے اور سرمایہ داروں کو

[1] تفسیر کبیر، فی تفسیر قولہ تعالیٰ انما الصدقات للفقراء والمساکین، ج١٦/ ص ١٠٣۔

بتایا گیا ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی مال اور مالدار دونوں کی پاکی کا باعث اور دونوں کے لیے خیر و برکت کا سرچشمہ ثابت ہوتی ہے۔ جیسے انگور کی اوپری شاخ کو کاٹ دینے کے بعد اس کی پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے۔ اسی طرح تجربہ اور مشاہدہ شاہد ہے کہ زکوٰۃ دینے والا نہ صرف اپنی دولت کو محفوظ پاتا ہے بلکہ اس کی بقا و ترقی اور اس کے اندر ایک خاص قسم کی برکت کو اپنی نظروں سے دیکھ بھی سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی یہ بھی بڑی حکمت تھی کہ اس نے زکوٰۃ کی تقسیم کو کسی کی رائے یا شخصی ذمہ داری پر نہیں چھوڑا اور نہ اس کو اُن انسانی جذبات کے حوالے کیا جن میں مد و جزر اور اتار چڑھاؤ ہر وقت ہوا کرتا ہے۔ اس کو قانون سازوں اور علما یا حکام کے حوالے بھی نہیں کیا اس لیے کہ ان پر کلی اعتماد نہ تھا۔ بلکہ اس کی تقسیم اور مصارف کی نشاندہی خود فرمائی اور زکوٰۃ پانے والوں کو آٹھ حصوں میں تقسیم کیا، غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آٹھ مصارف دو بنیادی قسموں میں بٹے ہوئے ہیں:

1. ایک قسم ان لوگوں کی ہے جو بجا طور پر ضرورت مند اور محتاج ہیں۔ ایسے لوگ فقرا مساکین، غلام اور ایسے مسافر ہیں جو وطن سے دور جا پڑے ہیں اور ان کا توشہ اور خرچ کے لیے روپیہ سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔
2. دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جن سے نفع کی امید ہوتی ہے، لیکن یہ ضروری نہیں ہوتا، کہ وہ خود ضرورت مند اور محتاج ہوں۔ اس زمرے میں زکوٰۃ کے وصول کرنے والے مؤلفہ قلوب مجاہدین اور ایسے مقروض شامل ہیں جو مسلمانوں کے باہمی جھگڑے مٹانے کے پیچھے یا کسی کی ضمانت وغیرہ لے لینے کے سبب قرض میں دب گئے ہوں، ورنہ یہ امر مسلم ہے کہ اگر لینے والا محتاج نہ ہو، یا اسے دینے میں عام مسلمانوں کا کوئی فائدہ نہ ہو تو ایسے آدمی کو زکوٰۃ کبھی نہیں دی جائے گی۔

یوں تو زکوٰۃ سال میں ایک بار فرض ہوتی ہے۔ البتہ باغات اور کاشت کا سال اس وقت پورا سمجھا جائے گا جب کہ پھل یا کھیتی پک کر تیار ہو اور اسی وقت کل پیداوار کا

دسواں حصہ سالانہ زکوٰۃ کے طور پر ادا کر دیا جائے گا۔عشر سال پر اس لیے واجب ہوگا کہ ہفتہ عشرہ کی ادائیگی واجب ہونے کی صورت میں مالداروں کا نقصان اور عمر میں ایک بار ادائیگی لازم کرنے کی صورت میں غریبوں کا نقصان ہوگا۔

زکوٰۃ کی مقدار کا تعین نصاب کی ملکیت رکھنے والوں کی مشقت اور سہولت کو مدنظر رکھ کر کیا گیا ہے۔ چنانچہ مال آدمی کو اچانک اور یک جا طور پر مل جائے۔ مثلاً: کان یا خزانہ وغیرہ تو اس میں سال گزرنے کا انتظار نہیں کیا جائے گا، بلکہ جس وقت وہ حاصل ہوگا اسی وقت کل مال کا پانچواں حصہ وصول کر لیا جائے گا۔ اس لیے کہ سال کی قید، افزائش اور منافع کے حصول کے لیے لگائی گئی ہے اور یہ کل نفع ہے۔ ہاں جس کی یافت میں خود اسکی محنت اور تگ و دو کا دخل ہو، اس پر دسواں حصہ واجب ہوگا۔ مثلاً: کھیتی اور پھل وغیرہ، پھر یہ وہ کاشت ہوئی جس کو بونے اور جوتنے کا کام خود اس نے کیا تھا، لیکن اس کی سینچائی کنویں یا رہٹ کی بجائے صرف بارش کے پانی کی مرہون منت تھی۔ البتہ اگر اس کی سینچائی کی مشقت بھی خود اسے برداشت کرنی پڑی تھی تو اس پر بیسواں حصہ واجب ہوگا۔ اگر کوئی کام ایسا تھا جس کی آمدنی اور افزائش کا انحصار مالک کی محنت، انتظام اور نگرانی پر تھا، جیسے تجارت، جس میں دور دراز کا سفر، اسباب کی نگرانی اور حفاظت اور فروخت کا طویل انتظار کرنا ہوتا ہے تو اس صورت میں مذکورہ بالا مقدار کا بھی نصف یعنی چالیسواں حصہ وصول کیا جائے گا۔ اس لیے کہ تجارت میں کاشت کاری سے زیادہ دیکھ بھال کی ضرورت ہوتی ہے۔ نیز تجارت کے مقابلے میں کاشت کاری میں پیداوار زیادہ اور اس کے مقابلے میں محنت قدرے کم صرف ہوتی ہے۔ اس لیے زرعی پیداوار کا بیسواں حصہ اور تجارتی اموال کا چالیسواں حصہ بطور زکوٰۃ لیا جائے گا۔ اسی طرح آسمانی پانی سے سیراب کھیتی میں پیداوار زیادہ اور محنت کم ہوتی ہے۔ جب کہ کنویں، رہٹ، یا نہری پانی سے سینچائی میں محنت زیادہ اور پیداوار کم ہوتی ہے۔ اس لیے پہلی صورت میں دسواں حصہ اور دوسری صورت میں بیسواں حصہ بطور زکوٰۃ لیا جائے گا۔

رہا دفینہ اور خزانہ تو دیگر تمام وسائل کے مقابلے میں دفینے کے اندر محنت نہیں کے برابر اور افزائش اور یافت تمام کی تمام ہوتی ہے، اس لیے دفینہ کا پانچواں حصہ بطور زکوٰۃ واجب ہوگا۔ پانچواں حصہ اس لیے کہ کل دفینہ پانے والے سے لے لینا، کسی طرح انصاف نہیں کہلائے گا۔ نہ ہی پانے والے کے حوالے کل دفینہ کر دینا، غریبوں کے لیے سود مند ہوگا۔'' [1]

زکوٰۃ کے لیے حکومتی یا جماعتی نظام

زکوٰۃ کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کی وصولیابی یا ادائیگی کی ذمہ داری تنہا افراد کے سر نہیں ڈالی گئی، نہ ہی انفرادی خیرات جیسی کوئی شکل اختیار کی گئی۔ اس لیے کہ اس صورت میں اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہوتا ہے کہ خدا اور آخرت پر اعتماد کرنے والے اس کی ادائیگی میں کوئی کسر نہ رکھتے، لیکن بد دین اور بے فکرے زکوٰۃ دینے کا نام تک نہ لیتے اور اس طرح یہ عظیم الشان منصوبہ رائیگاں ہوتا، جس کی تنظیم اور نفاذ کو پوری امت کی فلاح و بہبود کے لیے عمل میں لایا گیا تھا۔ اس لیے ضرورت اس کی ہوئی کہ جس طرح نماز کا مزاج اور اس کی ایک شرعی حیثیت ہے کہ اس کو جماعت کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ کا مزاج اور اس کی شرعی حیثیت یہ طے پائی کہ حکومت (یا جماعت) کی سرپرستی میں کوئی منظم ادارہ اس کی وصولیابی اور تقسیم کا ذمہ دار بنے اور اس اہم فریضہ کو بحسن وخوبی انجام دے۔

قرآن پاک کی صراحت

زکوٰۃ کے اجتماعی نظام کے لیے قرآن پاک نے ''عاملین'' (تحصیلدار اور ہرکارے) کے نام سے مستقل ایک جماعت کی داغ بیل ڈالی اور ان کو اس مد کے جملہ آمد و صرف کا ذمہ دار ٹھہرایا اور ان کے اخراجات کے لیے اسی مد سے ایک حصہ مقرر کیا، تاکہ وہ بے نیاز ہو کر یکسوئی سے اپنا کام کر سکیں۔

[1] زاد المعاد، فصل فی هدیه ﷺ فی الصدقة والزكاة، ج ٢/ ص: ٦، ٧۔

چنانچہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ إِنَّمَا الصَّدَقَٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَٰكِينِ وَالْعَٰمِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَٰرِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴾ (۹/ التوبہ:٦۰)

"صدقات تو صرف حق ہے غریبوں کا اور محتاجوں کا اور جو کارکن ان صدقات پر متعین ہیں اور جن کی دلجوئی کرنا منظور ہے اور غلاموں کی گردن چھڑانے میں اور قرضداروں کے قرضے میں اور جہاد میں اور مسافروں میں، یہ حکم اللہ کی طرف سے مقرر ہے اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے اور بڑی حکمت والے ہیں۔"

قرآن پاک کی اس صراحت کے بعد کسی قیل وقال کی گنجائش نہیں۔ایک دوسری آیت میں مصارف زکوٰۃ کا ذکر کرتے ہوئے قرآن پاک نے کہا ہے:

﴿ خُذْ مِنْ أَمْوَٰلِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا ﴾

(۹/ التوبہ:۱۰۳)

"آپ ان مالوں میں سے صدقہ لے لیجیے جس کے ذریعہ آپ ان کو گناہ کے آثار سے پاک وصاف کردیں گے۔"

سلف صالحین اور اس دور کے تمام علما اور عام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ صدقہ سے مراد زکوٰۃ ہے اور اس حکم کے مخاطب حضور ﷺ کی ذات گرامی اور وہ تمام افراد ہیں، جن کے ہاتھ میں مسلمانوں کی زمام اختیار ہو۔

اجتماعی نظام کی ضرورت

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اس کے راوی ہیں اور ان کی روایت صحیحین اور ان کے علاوہ دیگر کتب حدیث میں وارد ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجا اور ان کی روانگی کے وقت بڑی تاکید کے ساتھ فرمایا کہ "تم ایک ایسی قوم کے

پاس جا رہے ہو جو اہل کتاب ہیں۔ اس لیے سب سے پہلے:

((فَأَعْلِمْهُمْ أَنَّ اللّٰهَ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةً تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ وَتُرَدُّ عَلَى فُقَرَاءِهِمْ فَإِنْ هُمْ أَطَاعُوكَ لِذَالِكَ فَإِيَّاكَ وَ كَرَائِمَ أَمْوَالِهِمْ وَاتَّقِ دَعْوَةَ الْمَظْلُومِ فَإِنَّهُ لَيْسَ بَيْنَهَا وَ بَيْنَ اللّٰهِ حِجَابٌ)) [1]

انہیں اس بات کی دعوت دو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں۔ اگر وہ یہ بات قبول کر لیں تو ان کو بتاؤ کہ اللہ نے ان پر زکوٰۃ فرض کی ہے جو ان کے مالداروں سے لی جائے گی اور انہیں کے غریبوں کو دی جائے گی اور اگر وہ یہ بات بھی منظور کر لیں تو تمہیں چاہیے کہ ان کے بہترین مال پر ہاتھ ڈالنے سے پرہیز کرو اور مظلوم کی بددعا سے بچو، اس لیے کہ اللہ اور اس کے درمیان کوئی حجاب نہیں۔

حدیث کے ان الفاظ ((تؤخذ من)) سے پتہ چلتا ہے کہ محکمۂ تحصیلات کے کارندے زکوٰۃ کی فراہمی کے لیے مالداروں کے یہاں جائیں نہ یہ کہ اس مسئلہ کو ان کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے۔ علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے زکوٰۃ کی وصولیابی اور خرچ کا کام امام خود یا اس کا نائب کرے اور جو نہ دے اس پر سختی کرے۔'' [2]

تاریخ شاہد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کا عمل اس کے مطابق تھا۔ علما نے صراحت کی ہے کہ امام زکوٰۃ کی وصولیابی کا انتظام بھی سنت کے مطابق اسی طرح کرے، تاکہ کوئی جہالت یا بخل کے سبب زکوٰۃ نہ روکے۔ [3]

---

[1] بخاری، كتاب الزكاة، باب وجوب الزكاة، رقم: ١٣٩٥؛ ابوداود، كتاب الزكاة، باب فی زكاة السائمة، رقم: ١٥٨٤؛ نسائی، كتاب الزكاة، باب إخراج الزكاة من بلد الى بلد، رقم ٢٥٢٣؛ ابن ماجه، كتاب الزكاة، باب فرض الزكاة، رقم: ١٧٨٣۔ [2] فتح البارى، كتاب الزكاة، باب اخذ الصدقة من الاغنياء وترد فى الفقراء حيث كانوا، ج٣ ص: ٣٣١؛ نيل الأوطار، كتاب الزكاة، باب الحث عليها والتشديد فى منعها، ج٤ ص: ١٢١۔

[3] المجموع شرح المهذب، كتاب الزكاة، باب قسم الصدقات، ج٦/ ص ١٦٧۔

نیز مالداروں کا بھی فرض ہے کہ وہ امیر کے نمائندوں اور تحصیلداروں کے ساتھ تعاون کریں اور کچھ چھپائے بغیر پوری پوری زکوٰۃ ادا کریں۔ حضور ﷺ اور سلف صالحین کا یہی معمول تھا۔

حضرت جابر بن عتیک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے تمہارے پاس ایسے سوار آئیں گے جن سے ممکن ہے تمہیں نفرت بھی ہو جائے۔ لیکن بہرصورت جب وہ آئیں تو تم ان کے ساتھ کشادہ پیشانی کے ساتھ پیش آؤ اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔ اگر انہوں نے انصاف سے کام لیا تو ان کا اپنا فائدہ ہوگا اور اگر زیادتی کریں گے تو نقصان کے ذمہ دار خود ہوں گے۔ [1]

اس حدیث میں جو آپ ﷺ نے ان ہرکاروں کو باعثِ نفرت قرار دیا، تو اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کا کام روپیہ وصول کرنا ہوتا ہے اور یہ ہر کوئی جانتا ہے کہ روپیہ کے معاملے میں ہر کوئی تنگ دل ہوتا ہے:

﴿وَكَانَ الْإِنْسَانُ قَتُورًا﴾ (۱۷/ الاسراء: ۱۰۰)

''اور آدمی ہے بڑا تنگ دل۔''

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے حضور اکرم ﷺ سے کہا، اگر میں آپ ﷺ کے ایلچی کو اپنے ذمہ کی زکوٰۃ ادا کر دوں تو کیا اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک میں بری ہو جاؤں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں اگر تم نے اسے دے دیا تو تم بری ہو اور تمہیں اجر ملے گا اور گناہگار وہ ہوگا جو اس میں فرق کرے گا۔''

صحابہ کے فیصلے

سہیل بن ابو صالح اپنے والد کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ جب ان کے پاس اتنی رقم جمع ہو گئی جس پر زکوٰۃ واجب ہوتی تھی تو انہوں نے سعد بن ابی وقاص، ابو ہریرہ، ابو سعید خدری اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم سے دریافت کیا کہ میں ان کی زکوٰۃ حاکم وقت کے حوالے کر دوں؟ یا خود غریبوں میں تقسیم کر دوں، اس کے جواب میں ان سب نے یہی کہا

[1] ابوداود، کتاب الزکاۃ، باب فی رضاء المصدق، رقم: ۱۵۸۸۔

حاکمِ وقت کے حوالے کردو۔ دوسری روایت میں ہے کہ میں نے عرض کیا، آپ صاحبان دیکھ رہے ہیں کہ موجودہ حکام کس طرح زکوٰۃ کو استعمال کر رہے ہیں، کیا زکوٰۃ انہیں دینا درست ہے؟ (یہ بنوامیہ کا زمانہ تھا) جواب میں انہوں نے یہی کہا کہ زکوٰۃ حکام ہی کو دی جائے گی۔ (مسند سعید بن منصور)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، زکوٰۃ حاکم وقت کے پاس جمع کردو، اگر انہوں نے ٹھیک ٹھیک اس کا نظم کیا تو بہتر، ورنہ اس کا وبال خود ان کی گردن پر ہوگا۔ [1]

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے ایک ملازم سے جو طائف میں ان کی جائیداد کا نگران تھا۔ ایک بار دریافت کیا، ان کی زکوٰۃ کہاں خرچ کرتے ہو؟ اس نے جواب دیا، کچھ حاکم وقت کو دیتا ہوں اور جو بچ رہتی ہے، اسے غریبوں میں بانٹ دیتا ہوں۔ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے یہ سنا تو خفا ہوئے اور فرمایا، ساری زکوٰۃ حاکم کو کیوں نہیں دے دیتے؟ اس نے عرض کیا، آپ جانتے ہیں موجودہ حکام زکوٰۃ تک کو اپنے عیش ونشاط کے لیے استعمال کر رہے ہیں! کیا اس کے باوجود انہیں زکوٰۃ دینی چاہیے؟ آپ نے جواب دیا، کیوں نہیں، زکوٰۃ انہیں کے حوالے کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے یہی کہا ہے۔ [2]

مذکورہ بالا احادیث اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال کے مطالعہ سے یہ یقین پختہ ہو جاتا ہے کہ اسلامی شریعت زکوٰۃ کی جمع وتقسیم کو حکومتی سطح پر چلانا چاہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک طرف حکومت کے محکمہ تحصیلات کو زکوٰۃ کی رقم خاص طور پر جمع کرنے کا پابند بناتی ہے اور مستحق افراد کا پورا پورا جائزہ لینے کے بعد ان میں تقسیم کرنے کی تاکید کرتی ہے اور دوسری طرف عوام کو بھی خبردار کرتی ہے کہ وہ تحصیلداروں سے بہر صورت تعاون کریں۔ وہ قصور کریں تو کریں، لیکن خود اپنی طرف سے کسی قسم کا نقص یا قصور نہ آنے دیں، ورنہ اجتماعیت منتشر ہوگی اور بیت المال کا نظم بگڑ جائے گا۔

---

[1] السنن الكبرىٰ للبيهقى، كتاب الزكاة، باب الاختيار فى دفعها الى الوالى ج ٤ ص: ١١٥۔

[2] المجموع شرح المهذب، كتاب الزكاة، باب قسم الصدقات، ج٦/ ص: ١٦٢۔

اجتماعی نظام پر اصرار

ممکن ہے یہاں پہنچ کر کوئی یہ اعتراض کرے کہ دین و مذہب کا طریقہ کار تو یہ ہونا چاہیے کہ وہ لوگوں کے دل وضمیر کو بیدار کرے۔ ان کے سامنے اطاعت و فرمانبرداری کی کوئی اعلیٰ مثال اور نمونہ پیش کرے اور ان کے اندر اس قدر اشتیاق پیدا کرے کہ وہ محض اجر وثواب کے لیے از خود آگے بڑھیں اور خوشی خوشی اپنے ذمہ کی زکوٰۃ ادا کریں۔ ہاں اگر یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہو تو عذاب الٰہی اور برے انجام سے باخبر کر دیا جائے، لیکن یہ مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ حکومت کے کارندے محض ایک چیز یعنی زکوٰۃ کی وصولیابی کے لیے لوگوں کے پاس جائیں، ان سے مطالبہ کریں، نہ دیں تو انہیں ڈرائیں، دھمکائیں، حتیٰ کہ سزا بھی دیں۔ پھر صرف ایک کام کے لیے خاص طور پر اتنے بڑے نظام اور علیحدہ محکمہ کی داغ بیل ڈالنے کی کیا ضرورت؟ جبکہ یہ جبری طریقہ ہوا اور اس طریقہ پر عمل درآمد کسی دین یا مذہب کے لیے نامناسب ہے!

اس کے جواب میں ہم یہ عرض کریں گے کہ یہ طریقہ اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب کے لیے ناقابل قبول یا نامناسب ہو تو ہو، لیکن یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام کے لیے یہ کسی طرح ناموزوں نہیں ہوسکتا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام جہاں ایک عقیدہ ہے، ایک نظام بھی ہے اور اس کے پاس جس طرح افہام وتفہیم اور اخلاق کی قوت ہے، اسی طرح قانونی اور آئینی طاقت بھی اسے حاصل ہے۔ چنانچہ روز اول سے جس طرح اس کی بنیاد ایک آسمانی کتاب پر ہے، اس کے خمیر میں یہ بھی داخل ہے کہ ایک بااثر اور طاقت ورقوتِ نافذہ کا ہونا ضروری ہے، کیونکہ طاقت اور قوت وہ بات سمجھا دیتی ہے، جو ترغیب اور تفہیم کے باوجود سمجھ میں نہیں آتی، پھر اسلام کا کلمہ پڑھ لینے کے بعد یہ ممکن نہیں کہ کوئی بھی کلمہ گو دو دھڑوں میں اس طرح بٹ جائے کہ اس کا ایک رخ دین کی طرف رہے اور دنیا کی طرف دوسرا۔ یا اس کی زندگی کا ایک حصہ اقتدارِ وقت کی جبہہ سائی میں گزرے اور دوسرا اس کے اللہ کے در کی گدائی میں بسر ہو، بلکہ اسلام کا عقیدہ ہے کہ انسان اور اس کی زندگی، بلکہ اس کی

زندگی کا ہر لمحہ صرف ذات باری کی عبادت اور تابعداری کے لیے وقف رہے اور اس کے بدن کا جوڑ جوڑ اسی کے آگے خمیدہ اور اس کے احکام کا منتظر رہے اور عقل و نقل اسے تسلیم کرتی ہے کہ کسی چیز پر اختیار چیز والے کا ہوتا ہے۔ دوسرے کا نہیں، چنانچہ مکان میرا ہو اور رہنے سہنے کا اختیار آپ کو ہو؟ اسے کوئی سمجھدار ماننے کے لیے تیار نہ ہوگا۔ ملازم میرا ہو اور اختیار اس پر آپ کا چلے۔ یہ میرے لیے باعث شرم اور آپ کی طرف سے کھلا ظلم ہوگا۔ بالکل اسی طرح یہ کیونکر ممکن ہوسکتا ہے کہ زکوٰۃ جس کی تشکیل اور نفاذ باری تعالیٰ نے خود فرمایا اور اسے ایک مخصوص اجتماعی نظام کے ساتھ وابستہ کیا۔ کوئی نفس اس کی فرضیت کا اقرار کر لے، لیکن اس کے مخصوص نظام کو ٹھکرا دے اور اس طرح ایک زندہ اور متحرک فریضہ کو بے حد مضمحل اور زندہ درگور کردے، اسی متوقع اضمحلال اور مردنی کو ختم کرنے کے لیے یہ امر اشد ضروری ہے کہ زکوٰۃ کی جمع و تقسیم حکومت کا منظّم ادارہ کرے، نہ کہ دل اور ضمیر کے رحم و کرم پر اسے چھوڑ دیا جائے۔

اجتماعی نظام کی حکمتیں

ذیل میں ایسی چند وجوہات پیش کی جاتی ہیں جن سے اس نظام کو سمجھنے میں تقویت ہوگی۔

① عوام کی بھاری اکثریت، مال کی محبت اور دولت کی لالچ میں گرفتار ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں زکوٰۃ کا حکم سنا کر خاموش ہو جانا درحقیقت اس عظیم تر منصوبے کو خاک میں ملا دینے کے مترادف ہوگا اور غریبوں کی حق تلفی ہوگی۔

② افراد کی بجائے خود حکومت جب زکوٰۃ کی تقسیم کرے گی، تو غریبوں کی خودی اور عزت نفس کی حفاظت ہوگی اور کسی دینے والے کے اندر ریاکاری، یا کسی لینے والے کے اندر احساسِ کمتری کے جذبات پیدا نہ ہوں گے۔

③ انفرادی طور پر زکوٰۃ بانٹنے کی صورت میں عین ممکن ہے کہ کوئی غریب ڈھیروں خیرات جمع کر لے اور کوئی سرے سے محروم رہے۔

④ عام ذہن کچھ اس قسم کا بن گیا ہے کہ زکوٰۃ بس فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ آٹھ اصناف پر مشتمل زکوٰۃ پانے والوں کی طویل فہرست میں ان دونوں کا شمار اگر سرفہرست ہے تو ان کے بعد چھ قسم کے افراد پھر بھی لسٹ پر باقی رہ جاتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ اس فہرست میں شامل بعض مصارف ایسے ہیں جن کا تعین اور صحیح تشخیص صرف امت کے باصلاحیت اور بیدار مغز افراد ہی کر سکتے ہیں۔ مثلاً: امت کا یہی منتخب طبقہ یہ بتا سکتا ہے کہ خدا کی راہ میں جہاد کے لیے کس نوعیت کے ساز وسامان اور آلات کی ضرورت ہے یا اسلام کی صحیح نشر واشاعت کے لیے کس قسم کے مبلغین اور لٹریچر تیار کرنے چاہئیں۔

⑤ اسلام کے اندر مسجدوں اور خانقاہوں کا جمال بھی ہے اور حکومتوں اور سلطنتوں کا جلال بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے پاس جس طرح قرآن پاک کا دستور ہے، اسی طرح ایک سلطان کا وجود بھی۔ اس کے لیے بے حد ضروری ہے اور ہر کوئی جانتا ہے کہ حکومتوں کے نظم و نسق کے لیے مالیات کا شعبہ ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ سال بہ سال زکوٰۃ سے حاصل ہونے والی خاصی بڑی رقم اس شعبے کے لیے بڑی آسانی سے مستقل سالانہ آمدنی کا باعث ہوگی۔

بیت المال

قرون اولیٰ کی تاریخ بتاتی ہے کہ اسلامی حکومت جس کے پیش نظر صرف اغراض و مقاصد ہی نہ تھے بلکہ غریبوں، بے روزگاروں، اپاہج اور مقروضوں کی دستگیری اور کفالت بھی روز اوّل سے اس کے پروگرام میں داخل تھی۔ لہٰذا اس نے شروع سے خلافت و امارت کا نظام قائم کرنے کے بعد بیت المال کی داغ بیل ڈالی اور اس کے ساتھ اسلامی حکومت کے پورے مالی نظام کو وابستہ کیا، فقہی کتابوں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اس نظام میں آمدنی کے حسب ذیل شعبے شامل کیے گئے ہیں:

① زکوٰۃ، فطرہ اور عشر پر مشتمل یہ شعبہ غریب مسلمان کے لیے مخصوص ہے۔ حکومت اسے اپنے عام بجٹ یا دیگر اخراجات میں شامل نہیں کرے گی۔ بلکہ اس کی آمد و خرچ کا

مستقل ریکارڈ ہمیشہ علیحدہ رکھے گی۔

② جزیہ، خراج۔ اس ٹیکس کا نام ہے جو اسلامی مملکت میں رہنے والے غیر مسلموں سے ان کی جان و مال کی حفاظت کے عوض ہر سال وصول کیا جائے گا، انہیں ذمی کہا جاتا ہے۔ جنگی خدمات سے یہ بری ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ ان غیر مسلموں کی حفاظت مسلمانوں اور اسلامی حکومت کا فریضہ ہوتی ہے۔ اس مد سے مسلمان فوجیوں کی تنخواہ اور ان کے بال بچوں کی کفالت کی جائے گی۔ اسلحے اور جنگی سامان خریدے جائیں گے۔ قلعے، پل، بند اور نہریں نکالی جائیں گی، اسی طرح قاضی، مفتی، محتسب، اساتذہ اور ایسے تمام لوگوں کے روزینے دیئے جائیں گے، جو مسلمانوں کے کاموں میں مصروف ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عراق اور اس کے اطراف میں اسی ٹیکس کو عائد کیا تھا۔

③ دفینہ اور مال غنیمت، غریبوں کی امداد اور ان کے سماجی تحفظ کے لیے اس غیر مستقل اتفاقی آمدنی کا پانچواں حصہ بیت المال میں جمع کیا جائے گا۔

④ لاوارث مال اور گمشدہ اشیاء، اس قسم میں مسلمانوں کا وہ متروکہ سرمایہ شامل ہوگا، جس کا کوئی والی وارث دستیاب نہ ہوگا۔ اسی طرح وہ مال جن کے مالکوں کا پتہ نہ چل سکے۔ ایسے اموال بھی بیت المال میں شامل ہوں گے اور گمنام یا لاوارث بچوں کی پرورش اور ایسے مسلمانوں کی تجہیز و تکفین پر خرچ ہوں گے، جن کے پاس مال وغیرہ کچھ بھی نہ ہو۔ [1]

بیت المال کا اسلامی نظام اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ عبادت کی روح اور ٹیکس کی اسپرٹ رکھنے والے زکوٰۃ کے اجتماعی نظام کی بجائے انفرادی خیرات اور ہر شخص کی جدا جدا زکوٰۃ کو اسلام پسند نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے حکومت یا مسلمانوں کی نمائندہ کمیٹی کو اس کام کی نگرانی کے لیے خارجی پہریدار بتایا اور خدا اور آخرت پر یقین کرنے والے دل و ضمیر کو اس کے لیے اندرونی اور داخلی محافظ قرار دیا۔ چنانچہ اسی حکمت عملی کا یہ اثر

[1] المبسوط لشمس الدين السرخسی، کتاب الزکاة، باب مايوضع فيه الخمس ج۳ ص: ۱۸؛ البدائع والصنائع، کتاب الزکاة، فصل فی بيان مايوضع فی بيت المال من المال و بيان مصادرفهاج ۲ ص ۶۸-۶۹۔

ہے کہ آج بھی جہاں خلافت راشدہ کی سی اسلامی حکومت نظر نہیں آتی ۔ وہاں غریبوں اور مسکینوں کے لیے سب سے بڑا سہارا بندۂ مومن کا یہی دل وضمیر ہوتا ہے جو اس بات سے لرز اٹھتا ہے کہ اس کا پڑوسی اگر بھوکا سو رہا ہے تو کل قیامت کے دن وہ اپنے خدا کو کیا منہ دکھائے گا۔

فقیر اور مسکین کون؟

اس میں شک نہیں کہ حکومتوں کے لیے روپیہ فراہم کرنا آسان ہے، لیکن اسے صحیح موقع اور محل پر خرچ کرنا بے حد دشوار ہے اور اسی کا نتیجہ تھا کہ قرآن پاک نے شروع دن سے زکوٰۃ کے جملہ مصارف کی ازخود نشاندہی کی اور اس سلسلے میں کسی کی مداخلت کو گوارا نہ کیا۔ چنانچہ تفسیر کی کتابوں میں یہ صراحت ملتی ہے کہ زکوٰۃ اور خیرات کے روپیوں کی طرف جب منافقوں کی نظریں اٹھنے لگیں اور جب انہوں نے محض اس لیے سرور عالم ﷺ پر حرف گیری کی تو قرآن پاک نے کہا:

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ۚ..........وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝﴾ (۹/ التوبہ: ۵۸ ، ۶۰)

”اور ان میں بعض لوگ صدقات کی تقسیم میں تم پر طعن کرتے ہیں......اور اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔“

اس سلسلے کا ایک واقعہ ابوداود رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے زکوٰۃ کی رقم طلب کی تھی۔ آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا: ”اس بارے میں خدا نے میرے یا کسی کے فیصلے کی بجائے اپنی طرف سے فیصلہ صادر فرما دیا ہے اور زکوٰۃ کے آٹھ مصارف تجویز کیے ہیں۔ اگر تم ان میں سے کسی ایک میں اپنے آپ کو شامل سمجھتے ہو تو مجھے دینے میں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔“

سردست ہم زکوٰۃ کے ان مصارف میں سے پہلے دو مصرف یعنی فقرا اور مساکین کی وضاحت کریں گے۔ اس لیے کہ یہی دو افراد ہماری بحث سے خاص طور پر متعلق ہیں۔

فقرا اور مساکین کی تعریف میں فقہا اور مفسرین کے درمیان خفیف سا اختلاف ہے۔ لیکن راجح قول یہ ہے کہ فقیر وہ ہے جو ضرورت اور حاجت کے باوجود کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلائے اور مسکین وہ ہے جو ہر کس و ناکس کے سامنے دست سوال دراز کرے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ فقیر وہ ہے جس کے پاس کچھ نہ ہو اور مسکین وہ ہے جس کے پاس کچھ نہ کچھ موجود ہو۔

یہاں اس امر کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ اسلامی تعلیمات کا صحیح علم نہ ہونے کی بنا پر لوگوں نے غلطی سے زکوٰۃ کا حقداران بھکاریوں اور گداگروں کو سمجھ لیا ہے جن کی لمبی لمبی قطاریں، مسجدوں، مزاروں اور بازاروں میں نظر آتی ہیں۔ عوام الناس کی اسی غلط فہمی کے ازالے کے لیے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا:

((لَيْسَ الْمِسْكِينُ الَّذِي تَرُدُّهُ التَّمْرَةُ وَالتَّمْرَتَانِ وَلَا اللُّقْمَةُ وَلَا اللُّقْمَتَانِ إِنَّمَا الْمِسْكِينُ الَّذِي يَتَعَفَّفُ اِقْرَؤُوا إِنْ شِئْتُمْ [1] ﴿لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا﴾)) (۲/ البقرۃ: ۲۷۳)

''ایک دو کھجوروں یا روٹی کے چند لقموں کے لیے در در کی ٹھوکریں کھانے والا فقیر نہیں، فقیر وہ ہوتا ہے، جو سرے سے سوال نہ کرے۔ چنانچہ تم چاہو تو یہ آیت پڑھو: ﴿لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا﴾ (۲/ البقرۃ:۲۷۳)

قرآن پاک کی مذکورہ بالا آیت اسی مفہوم کو واضح کرتی ہے کہ وہ لوگوں سے لگ لپٹ کر سوال نہیں کرتے اور نہ بلا حاجت اور ضرورت کے کسی سے کچھ مانگنے کی جسارت کرتے ہیں۔ اس لیے کہ بقدر ضرورت اسباب رکھتے ہوئے سوال کرنا الحاف ہے۔

اس آیت کے مصداق درحقیقت فقرا مہاجرین تھے۔ (رضی اللہ عنہم) جنہوں نے اللہ

[1] بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ البقرۃ، باب قوله تعالیٰ لا یسئلون الناس إلحافا، رقم: ٤٥٣٩؛ ابوداود، کتاب الزکاۃ، باب من یعطیٰ من الصدقة وحد الغنی، رقم: ١٦٣١؛ نسائی، کتاب الزکاۃ، باب تفسیر المسکین، رقم: ٢٥٧٤؛ مسند احمد: ١/ ٣٨٤، رقم: ٣٦٢٩؛ دارمی، کتاب الزکاۃ، باب المسکین الذی یتصدق علیه، رقم: ١٦١٥؛ مؤطا مالك، کتاب صفة النبی ﷺ، باب فی المساکین، رقم: ٧۔

اوراس کے رسول کی محبت میں سب کچھ تج دیا اور سخت ضرورت منداور محتاج رہتے ہوئے کبھی کسی سے کچھ طلب نہیں کیا۔انہیں کی شان میں باری تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۷۳)

''صدقات اصل حق ان حاجتمندوں کا ہے جو مقید ہو گئے ہوں اللہ کی راہ میں اور اسی وجہ سے وہ لوگ کہیں ملک میں چلنے پھرنے کا عادتاً امکان نہیں رکھتے اور ناواقف ان کو تونگر خیال کرتا ہے ان کے سوال سے بچنے کے سبب سے، البتہ تم ان کو ان کے طرز سے پہچان سکتے ہو کہ فقروفاقہ سے چہرے پر اثر ضرور آجاتا ہے۔ وہ لوگوں سے لپٹ کر مانگتے نہیں پھرتے۔''

اس میں شک نہیں کہ حقیقی فقرا اور مساکین کو عوام الناس نے نظر انداز کر دیا اور ان کے اوصاف کو بھی فراموش کر گئے اور ان کا حق ایسوں کو دینا شروع کیا جو کسی طرح اس کے مستحق نہ تھے، لیکن یہ رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی تھی کہ آپ نے تصویر کے حقیقی رخ کو لوگوں کے سامنے پیش کیا اور حق کو حقدار تک پہچانے کی تلقین فرمائی۔

چنانچہ حضور ﷺ کی ان توجہ دہانیوں کو ذہن میں رکھ کر ایک دردمند اور وفا شعار مسلمان اپنے شہر اور اپنے پڑوس میں اگر ان اوصاف کے حامل فقیروں اور مسکینوں کو تلاش کرے گا تو اسے نظر آئے گا کہ کتنے ایسے گھر ہیں جن کی چار دیواری میں بند رہنے والے اس حال میں صبح کرتے ہیں کہ فاقے سے ان کے چہرے پژمردہ اور جسم لاغر ہوتے ہیں، لیکن کسی کے سامنے اپنی مصیبت کا رونا نہیں روتے۔

فقیروں کی ایک قسم

غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ فقرا اور مساکین کے ضمن میں ایسے افراد بھی شامل

ہوتے ہیں جن کی آمدنی کم اور خرچ حد سے بڑھا ہوتا ہے۔ حالانکہ ان کا اپنا گھر ہوتا ہے زندگی کے دن جیسے تیسے کاٹنے کے لیے گھر میں کچھ سامان مہیا ہوتا ہے، یہاں تک کہ بعض کے پاس اتنا مال بھی میسر ہوتا ہے جو بقدر نصاب نہیں ہوتا، لیکن علمائے امت کے اقوال کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ایسے افراد زکوٰۃ لے سکتے ہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ یہ دوسروں کے سامنے زکوٰۃ مانگنے کے لیے ہاتھ نہ پھیلائیں۔

ذیل میں اس مسئلے کو کسی قدر تفصیل سے پیش کیا جاتا ہے۔

حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا، ایک شخص رہائش کے لیے مکان اور خدمت کے لیے غلام رکھتا ہے، کیا وہ زکوٰۃ لے سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا: یہ سب ہوتے ہوئے اگر اسے احتیاج ہے تو لے سکتا ہے۔ [1]

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا، اگر کوئی صاحب جائیداد ہو یا کوئی ملکیت اس کے قبضے میں ہو جس کی قیمت لگ بھگ دس ہزار درہم (کم و بیش اسی ہزار روپیہ) ہو، لیکن وہ اس کی گزراوقات کے لیے ناکافی ہو تو کیا وہ زکوٰۃ لے سکتا ہے؟ آپ نے اثبات میں فرمایا: ہاں وہ زکوٰۃ لے سکتا ہے۔ [2]

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اگر کسی کی آمدنی اس کے خرچ سے کہیں زیادہ ہو، خواہ وہ صاحب نصاب ہو یا اس سے زیادہ کا مالک ہو، تب بھی وہ زکوٰۃ قبول کر سکتا ہے۔ [3]

احناف کے نزدیک اس شخص کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے، جو رہائشی مکان، ضروری اثاثہ، خدمت گزار، بدن کے کپڑے اور سواری کا مالک ہو اور اہل علم ہو تو ضروری کتابوں کا ذخیرہ گھر میں رکھتا ہو، ان کی دلیل حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا وہ قول ہے جس میں آپ نے فرمایا: وہ لوگ زکوٰۃ کا روپیہ ایسوں کو بھی دیتے تھے جو ہزاروں روپے کی مالیت کا رہائشی مکان، ہتھیار، نوکر چاکر اور سواری کا جانور رکھتے تھے۔*

---

[1] كتاب الأموال، لابى عبيد باب اذا اعطى صاحب المال الغنى أجزاه، ص: ٥٥٧۔
[2] المغنى، كتاب الزكاة، فصل مسئلة لا تحل الصدقة لغنى، ج٢، ص: ٦٦١۔
[3] المجموع شرح المهذب، كتاب الزكاة، باب فى قسم الصدقات، ج٦ ص: ١٩٢۔

اس روایت میں ''وہ لوگوں'' سے مراد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس قدر مالیت رکھنے والوں کو زکوٰۃ اس لیے دیا کرتے تھے کہ ان کی آمدنی ان کے اخراجات کے لیے ناکافی ہوتی تھی، رہی ان کی مالیت، تو ان کا تعلق ضروریاتِ زندگی سے تھا، فاضل سرمائے سے وہ بہر صورت تہی دست ہوتے تھے۔ [1]

مذکورہ بالا بیان اس امر کی وضاحت کے لیے کافی ہے کہ تہی دست اور مفلس ہی زکوٰۃ کے مستحق نہیں، بلکہ یہ مدان کے لیے بھی ہوگی، جن کے پاس روزمرہ ضروریات زندگی کی چیزیں ہوں گی، لیکن پھر بھی ان کی آمدنی ان کے لیے ناکافی ہوگی اور کمانے کی صلاحیت سے وہ محروم ہوں گے۔

تندرست کمانے والا زکوٰۃ نہیں لے سکتا

(الف) اس بات سے ہر کوئی واقف ہے کہ زکوٰۃ مجبوروں اور بے کسوں کے لیے ہے اور فقیر اور مسکین بھی زکوٰۃ کے حقدار اسی حاجت اور عجز و درماندگی کی وجہ سے ہوتے ہیں، لیکن یہ تلخ حقیقت ہے کہ بعض سادہ لوحوں نے فقیروں اور مسکینوں کی شناخت میں غلطی کی اور ان گداگروں اور بھکاریوں کو اس کا حقدار سمجھ لیا، جنھوں نے گداگری اور بھیک کو پیشہ بنا لیا اور محنت اور کام کرنے سے دست بردار ہو گئے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ زکوٰۃ کے ذریعہ گداگری اور کام نہ کرنے کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور زکوٰۃ غریبی کا کوئی علاج نہیں۔ درحقیقت یہ نادان اتنا نہیں جانتے کہ ان کا انداز فکر اور طریق کار اسلامی تعلیمات سے کس قدر دور ہے!

چنانچہ اس کتاب کے باب سوم میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ محنت مشقت کرنا اور اپنے خون پسینے کی کمائی کھانا کس قدر افضل عمل ہے۔ اسی عمل کی فضیلت میں وہ حدیث ذکر کی گئی، جس میں آپ ﷺ نے فرمایا:

((مَا اَكَلَ اَحَدٌ طَعَامًا قَطُّ خَيْرًا مِّنْ اَنْ يَّأْكُلَ مِنْ عَمَلِ يَدِهِ)) [2]

---

[1] البدائع والصنائع، كتاب الزكاة، فصل وأمَّا الذي يرجع الى المؤدى اليه فانواعٌ ج ٢/ ٤٨۔

[2] بخاری، كتاب البيوع، باب كسب الرجل و عمله بيده، رقم: ٢٠٧٢۔

''کوئی آدمی اپنے ہاتھوں کی کمائی سے زیادہ لذیذ کھانا نہ کھایا ہوگا۔''

نیز اسی لیے آپ ﷺ نے صراحت سے فرمادیا کہ

((لَا تَحِلُّ الصَّدَقَةُ لِغَنِيٍّ وَلَا لِذِيْ مِرَّةٍ سَوِيٍّ)) [1]

''وہ شخص زکوٰۃ کا مستحق نہیں، جو مالدار ہو اور تندرست ہونے کی بنا پر کمانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔''

(ب) ہاں اگر کوئی شخص تندرست اور صحیح سالم ہو، لیکن اسے کوئی روزگار میسر نہیں تو اسے زکوٰۃ دی جائے گی۔ اس لیے کہ روزگار نہ ملے تو خواہ کوئی کتنا ہی توانا کیوں نہ ہو، وہ پیٹ کے لیے روٹی، یا تن کے لیے کپڑا حاصل نہ کر سکے گا۔ چنانچہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

بیروزگار تندرست آدمی زکوٰۃ وصول کر سکتا ہے، اس لیے کہ وہ بھی عاجز اور درماندہ ہے۔ [2]

علاوہ ازیں گزشتہ صفحات پر ایک حدیث پیش کی گئی جس میں کہا گیا کہ مال دار اور تندرست آدمی کو زکوٰۃ لینے کا حق نہیں، لیکن ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ غنی اور قوی کے ساتھ ساتھ ایک اور شرط بے روزگار کی بھی ہے۔ چنانچہ عبید اللہ بن عدی کو دو آدمیوں نے یہ آپ بیتی سنائی کہ وہ دونوں بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور زکوٰۃ کی رقم طلب کی، پہلے آپ نے ہمیں اوپر سے نیچے تک دیکھا، ہم دونوں تندرست اور توانا تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر تمہاری خواہش یہی ہو تو میں زکوٰۃ دے دیتا ہوں، لیکن خوب سمجھ لو کہ تندرست اور کمانے کی صلاحیت رکھنے والا زکوٰۃ طلب کرنے کا حقدار نہیں۔'' [3]

چونکہ یہ دونوں بظاہر تندرست تھے لیکن اندر کا حال معلوم نہ تھا کہ کثیر العیال ہیں یا نہیں، اس لیے آپ نے انہیں اختیار دیا، اسی حدیث کے پیش نظر علما نے کہا ہے کہ زکوٰۃ

[1] ابوداود، کتاب الزکاۃ، باب ما یعطیٰ من الصدقة وحد الغنی، رقم: ١٦٣٤؛ ترمذی، کتاب الزکاۃ، باب من لا تحل له الصدقة، رقم: ٦٥٢؛ نسائی، کتاب الزکاۃ، باب اذا لم یکن له دراهم وکان له عدلها، رقم: ٢٥٩٨؛ ابن ماجه، کتاب الزکاۃ، باب من سأل عن ظهر غنًی، رقم: ١٨٣٩؛ دارمی، کتاب الزکاۃ، باب من تحل له الصدقة، رقم: ١٦٣٩۔

[2] المجموع، کتاب الزکاۃ، باب قسم الصدقات، ج٦/ ص: ١٩٠۔ [3] نسائی، کتاب الزکاۃ، باب مسألة القوی المکتسب، رقم: ٢٥٩٩؛ مسند احمد: ٤/ ٢٢٥، رقم: ١٧٥١١۔

دینے والا لینے والے کو سمجھائے۔ [1]

جاننا چاہیے کہ کمانے والا جو زکوٰۃ نہیں لے سکتا۔ اس سے مراد کافی آمدنی والا ہے اس لیے کہ ناکافی آمدنی والا زکوۃ لے سکتا ہے۔ خواہ وہ فقیر یا اپاہج نہ ہو، امام نووی نے بھی کمانے والے کی یہی تعریف کی ہے [2] اس سب کا مقصد دراصل یہ بتانا ہے کہ اسلام بیکاری یا گداگری کو رواج نہیں دیتا۔ وہ صاف اعلان کرتا ہے کہ ہر کوئی جسے خدا نے تندرستی اور کمانے کی صلاحیت دی ہے، اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے محنت مشقت اور کام کاج کرے اور یہ سمجھ لے کہ دوسرے کی روٹی توڑنے سے بہتر یہ ہے کہ اپنی کمائی سے خود بھی کھائے اور دوسروں کو بھی کھلائے، ہاں اگر کوئی اس لائق نہ ہو کہ محنت کر سکے، یا وہ محنت کرتا ہو، لیکن اس کے اہل وعیال کا حد سے بڑھا ہوا خرچ اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتا ہے تو ایسے شخص کو بلا جھجک بقدرِ ضرورت زکوٰۃ لینی چاہیے، لیکن جب وہ زکوٰۃ سے بے نیازی کی حد کو پہنچ جائے تو اس کے لیے ضروری اور مناسب ہوگا کہ جلد سے جلد ننگ اور عار سے خود کو بچا لے اور اس زمرہ سے نکلنے کی فکر کرے اور اگر زکوٰۃ لیے بغیر کوئی چارہ نہ ہو، تو پورے سکون قلب کے ساتھ زکوٰۃ کی رقم کو استعمال کرتا رہے۔ اسلیے کہ یہ خدا کی طرف سے اس کی پرورش اور کفالت کا قدرتی نظم ہے۔ اس کی شان کریمی کا یہ ادنی کرشمہ ہے کہ تندرست پرندوں کے ذریعے اپاہج کو روزی پہنچاتا ہے۔ پھر وہ تو انسان ہے اس کا درجہ بے زبان جانوروں سے گھٹا ہوا کب ہو سکتا ہے؟

اسلامی تعلیمات کے ماہرین کی یہ رائے بھی مبنی برحقیقت ہے کہ تندرست اور باصلاحیت آدمی اگر خدا کی عبادت کے لیے یکسو ہونا چاہے اور کام کاج کی بجائے زکوٰۃ اور خیرات پر گزارہ کرنے لگے تو اسے کچھ نہ دیا جائے گا۔ (حاشیہ روض ج۱ص۴۰۰) اس لیے کہ اس رہبانیت اور جوگی پن کے لیے اسلام میں کوئی گنجائش نہیں بلکہ سچی عبادت حلال روزی کی تلاش کے ساتھ وابستہ ہے۔ ہاں علوم وفنون کی تحصیل کے لیے یکسو ہونے والے طلبہ جو

---

[1] نیل الأوطار، کتاب الزکاۃ، ابواب الأصناف الثمانیة، ج٦ ص: ١٦٥۔

[2] المجموع شرح المهذب، کتاب الزکاۃ، باب قسم الصدقات، ج٦ص: ١٩٠۔

بیک وقت کمانے اور پڑھنے کا کام نہیں کر سکتے۔ زکوٰۃ کے مستحق بن سکتے ہیں اور یہ استحقاق انہیں اس لیے حاصل ہوگا کہ وہ فرض کفایہ ادا کرتے ہیں۔ دوسرے ان کے علم سے آگے چل کر ان کی ذات اور پوری قوم کو نفع پہنچے گا؟

اس موقع پر زکوٰۃ نکالنے والوں کے لیے بعض علمائے دین کی یہ وضاحت یقیناً سودمند ہوگی کہ زکوٰۃ ایسے طلبا کو دینی چاہیے جو ممتاز صلاحیتوں کے مالک ہوں، جو ملک و ملت کے سچے اور بے لوث خدمت گزار بننے کا جذبہ دل میں رکھتے ہوں، اور جو دورانِ تعلیم کام نہ کر سکتے ہوں۔ [1] ورنہ انہیں زکوٰۃ نہ ملے گی۔ یہ امر انتہائی قابل قدر بھی ہے اور بے حد اہم بھی، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سی ترقی یافتہ حکومتیں اعلیٰ تعلیم کے لیے ہونہار اور ممتاز طلبا کو منتخب کرتی ہیں اور اپنے خرچ سے انہیں اندرون اور بیرون ملک بھیجتی ہیں۔

دائمی علاج

مصارف زکوٰۃ کی وضاحت کے بعد یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ بتایا جائے کہ غریبوں اور مسکینوں میں فی کس کس قدر زکوٰۃ کی ادائیگی مفید ہوگی؟ یہ وضاحت اس لیے اہمیت کی حامل ہے کہ عام طور پر دیکھا جا رہا ہے کہ کل تک جو زکوٰۃ لیتے تھے، وہ آج بھی زکوٰۃ لیتے ہیں اور اپنے آپ کو غریب کہتے ہیں اور صورتحال کی اس نزاکت کا سہارا لے کر کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ زکوٰۃ بھی وقتی علاج ہوا جس سے درد گھڑی بھر کے لیے رفع ہوا، لیکن اصل بیماری ہنوز برقرار رہی۔ آیندہ سطروں میں فکر ونظر کی اسی خرابی کو دور کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

تمہید کے طور پر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ غریب دو قسم کے ہوتے ہیں، پہلی قسم ان غریبوں کی ہے جو غریب ہونے کے ساتھ کسی جسمانی یا ذہنی بیماری میں مبتلا ہو کر اپاہج اور معذور ہو جاتے ہیں یا معمر ہونے کی وجہ سے کوئی کام نہیں کر سکتے۔ ظاہر ہے ایسوں کی غریبی لا علاج ہے اور متبادل امداد فراہم ہونے تک ان کے لیے تاحیات زکوٰۃ کی فراہمی کے سوا کوئی دوسرا سہارا نہیں ہے۔ لہٰذا اس قسم کے غریب ومسکین کی گزر بسر اگر صرف زکوٰۃ پر ہو تو

[1] المجموع شرح المهذب، كتاب الزكاة، باب قسم الصدقات، ج٦ ص: ١٩٠۔

اس میں چنداں حیرت بھی نہیں کرنی چاہیے۔

اب رہی دوسری قسم تو اس میں وہ غریب شامل ہیں جو اگرچہ تہی دست اور مفلس ہوتے ہیں، لیکن درحقیقت یہ اس لائق بھی ہوتے ہیں کہ ہاتھ اور پیروں کو حرکت دیں اور کچھ سہارا پا کر مزید سہارا خود پیدا کر لیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس دوسری قسم کی غریبی کا علاج نہیں، بلکہ زکوٰۃ کے ذریعہ انہیں ایک بار وہ سہارا مل سکتا ہے جس سے وہ آئندہ زکوٰۃ لینے کی بجائے دینے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کر سکتے ہیں اور پھر اللہ نے چاہا تو یہ شبہ اپنے آپ فنا ہو جائے گا کہ زکوٰۃ سے غریبی کا ازالہ ہوتا ہے یا اس میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔

اس مقصد کے لیے زکوٰۃ کی تقسیم کا ایک طریقہ جو اسلامی اسپرٹ سے زیادہ قریب ہے، یہ ہے کہ امداد اس طرح کی جائے کہ غریبوں کی جملہ ضروریات کی تکمیل ہو جائے اور ان کا احتیاج سدا کے لیے ختم ہو جائے، تا کہ دوبارہ زکوٰۃ لینے کی محتاجی بھی نہ رہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''علمائے عراق اور علمائے خراسان کا اس پر اتفاق ہے کہ فقیروں کو اس قدر دیا جائے جس سے ان کا فقر زائل ہو اور بے نیازی انہیں حاصل ہو۔ امام شافعی کا مسلک بھی یہی ہے ان کی دلیل قبیصہ بن مخارق ہلالی کی وہ روایت ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''صرف تین قسم کے آدمیوں کو سوال کرنے کی اجازت ہے۔ (۱) وہ شخص جو قرض میں گرفتار ہو، اسے اس حد تک مانگنے کی گنجائش ہے جس میں اس کی ضرورت پوری ہو جائے (۲) وہ شخص جسے فاقے کی نوبت آ جائے اور پاس پڑوس والے بھی اس کا اعتراف کریں۔'' (راوی نے تیسرے شخص کو بیان نہیں کیا)

لیکن ان کے علاوہ کسی شخص کو مانگنا جائز نہیں۔ اس کے باوجود اگر کوئی مانگتا ہے تو قبیصہ یوں سمجھو کہ وہ زنا کی کمائی کھا رہا ہے۔ [1]

اس روایت سے معلوم ہوا کہ اس حد تک سوال درست ہے جس سے احتیاج اور

[1] مسلم، کتاب الزکاۃ، باب من تحل له المسألة، رقم: ۲٤۰٤؛ ابوداود، کتاب الزکاۃ، باب ما تجوز فيه المسألة، رقم: ۱٦٤۰؛ نسائی، کتاب الزکاۃ، باب الصدقة لمن تحمل حمالةً، رقم: ۲۵۸۰۔

ضرورت رفع ہو سکے۔

اس امر کی صراحت یقیناً دشوار ہے کہ جو غریب کسی صنعت یا ہنر کے مالک ہیں، لیکن سرمائے کی کمی، یا مناسب اوزار یا مشینوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے بیکاری یا پھر مفلسی کا شکار ہوں، انہیں زکوٰۃ کی کس قدر مقدار دینی چاہیے۔ یہ اس لیے کہ موقعہ اور زمانے کے لحاظ سے ان میں کافی فرق ہوتا ہے۔ پھر بھی ذیل میں ایک ایسا تخمینہ پیش کیا جا رہا ہے، جس سے کسی حد تک رہنمائی مل سکتی ہے۔

① پھیری کرنے والوں مختلف چھوٹا موٹا دھندا کرنے والوں، علی ہذا سبزی، ترکاری بیچنے والوں کو ۳۵ تا ۷۰ روپوں تک دیا جائے گا۔ (بقول مصنف: ۵ تا ۱۰ درہم)

② اوسط درجے کے تاجر، چھوٹا موٹا ہوٹل چلانے والوں اور عطر بیچنے والوں کو بقدر ضرورت سینکڑوں روپیوں تک دیا جائے گا۔ درزی کو اتنا دیا جائے گا جس سے وہ سلائی کے لیے مشین خرید لے، بڑھئی اور دوسرے دستکاری کرنے والوں کو بھی اتنا سرمایہ دیا جائے، جس سے وہ اپنے لیے کارآمد اوزار اور کل پرزے خرید لیں۔

③ سونے چاندی کے زیورات بنانے والے، کھیتی باڑی جاننے والے حتیٰ کہ قیمتی پتھروں کی تجارت سے باخبر افراد کو اگر سینکڑوں کی امداد ناکافی ہو تو ہزاروں سے ان کی مدد کی جائے گی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ از کار رفتہ اور بوڑھوں کے لیے مستقل امداد کی بہترین شکل یہ نکالی جا سکتی ہے کہ ان کے لیے کوئی ایسی مناسب چیز ایک بار خرید لی جائے جس کے ماہانہ یا ہفتہ واری کرائے سے تاحیات ان کی گزر بسر ہو سکے۔ [1]

یہ مسلک امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک بھی یہی ہے۔ [2]

یہ ہم نہیں کہتے، ائمہ دین کہتے ہیں، ان اقوال کی روشنی میں یہ ثابت ہوتا ہے کہ غریبی کو ہٹانے کے لیے اسلام کس قدر کوشاں ہے اور اس کی پیش کردہ تجویز اس کے مرض کے ازالے کے لیے کس قدر موثر اور زود اثر ہے۔

---

[1] شرح المهذب، كتاب الزكاة، باب قسم الصدقات، ج ٦ ص: ١٩٤۔

[2] الانصاف، كتاب الزكاة، باب ذكر اهل الزكاة، ج ٣ ص: ١٩٩۔

زکوٰۃ وہ اس طرح دیتے تھے

دائمی علاج کے تحت ہم نے جو کچھ تحریر کیا ہے، یہ حقیقت ہے کہ اسلامی تاریخ اس سلسلے میں ہماری واضح رہنمائی کرتی ہے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت، آپ کے اس جملے کی بھرپور عکاسی کرتا ہے کہ غریبوں کو اتنا دو کہ وہ بے نیاز ہو جائیں۔ [1] غرض حضرت عمر رضی اللہ عنہ روٹی کے چند لقموں یا کچھ سکوں کو امداد کے لیے قطعی ناکافی سمجھتے تھے۔ مزید تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ ایک شخص نے آپ کے پاس آ کر تہی دستی کا شکوہ کیا، آپ نے اسے تین اونٹنیاں مرحمت فرمائیں۔ اس گراں قدر امداد کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ کہ امداد لینے والا بے نیاز ہو جائے اور پھر سے زکوٰۃ لینے کے لیے رخ نہ کرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تحصیلداروں اور زکوٰۃ بانٹنے والوں کو تاکید فرمائی تھی کہ ضرورت مند جتنی مرتبہ زکوٰۃ لینے آئیں، انہیں دو۔ خواہ ہر ایک کو سو اونٹ تک کیوں نہ دینا پڑے۔

غریبوں کے بارے میں ایک موقف کی وضاحت کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر فرمایا: بار بار زکوٰۃ دینے سے میں نہیں رکتا خواہ مجھے ایک شخص کو سو اونٹ کیوں نہ دینا پڑے۔ [2]

حضرت عطاء تابعی رحمۃ اللہ علیہ زبردست فقیہ تھے، فرماتے تھے، میں یہ زیادہ پسند کرتا ہوں کہ آدمی کسی کو اتنی زکوٰۃ دے دے جو اس کے لیے کافی ہو جائے۔ اسلامی اقتصادیات کی فقید المثال شخصیت، ابو عبید نے اپنی کتاب ''الاموال'' میں اس موقف کی پرزور تائید کی ہے۔ (ص ٥٦٦)

☆...... لیکن اگر اسلامی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو اس سلسلے میں ہمیں ایک اور موقف نظر آئے گا جسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے علمائے اسلام نے پسند کیا

---

[1] كتاب الاموال، باب ادنى ما يعطى الرجلُ الواحد من الصدقة وكم اكثر ما يطيب له منها، ص: ٥٦٥۔ [2] كتاب الاموال، باب يعطى الرجل الواحد من الصدقة ما يغنيه، ص: ٥٦٥۔

ہے، وہ یہ ہے کہ غریبوں کو عمر بھر کی بجائے صرف سال بھر کے لیے کافی رقم دے دینی چاہیے اور کوشش اس بات کی کرنی چاہیے کہ اس میں کمی نہ آئے۔ اس موقف کی تائید صحیحین کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے گھر والوں کے لیے کبھی سال بھر کی ضروریات بھی مہیا فرمائی تھیں۔ علاوہ ازیں زکوٰۃ ہر سال واجب ہوتی ہے اور ادا بھی کی جاتی ہے، لہٰذا عمر بھر کے لیے یا سال بھر سے کم کے لیے امداد کرنے سے بہتر یہی معلوم ہوتا ہے کہ پورے سال کے لیے امداد کی جائے، ممکن ہے مذکورہ بالا دونوں موقف کو پڑھ کر کوئی یہ شبہ کرے کہ اس صورت میں زکوٰۃ لینے والا غریب نہ رہے گا، بلکہ مالدار ہو جائے گا اور زکوٰۃ غریبوں کے لیے ہے، مالداروں کے لیے نہیں ہے۔

اس کا آسان جواب یہی ہے کہ غور کریں تو معلوم ہو کہ لینے کے وقت وہ غریب تھا، لہٰذا مستحق ہوا۔ دوسرے اسے مالدار کیوں کر کہا جائے گا جب کہ اس کی سابقہ اور حالیہ ضرورتیں دم کی دم میں اس کی کل جمع پونجی کو ختم کر دیں گی اور وہ بدستور خالی ہاتھ ہو جائے گا۔ [1]

☆...... پھر اسے ہماری کوتاہ نظری سمجھنی چاہیے کہ ہم نے صرف کھانے اور کپڑے کو زندگی کی ضرورت سمجھا اور زندگی کی سب سے اہم ضرورت یعنی ازدواج اور شادی بیاہ کو نظر انداز کر دیا۔ جس کے سامنے جملہ ضروریات ہیچ اور فروتر ہیں۔ یہ اس لیے کہ جنت ارضی کی ساری رونق اور ویران دنیا کی تمام آبادکاری کا دارومدار اسی ایک عمل پر ہے اور کوئی مرد یا عورت خود کو اس فطری جذبے سے علیحدہ نہیں کر سکتا۔ پھر اسلام جو دین فطرت کا علمبردار ہے، اس فطری جذبے کا گلہ کیونکر گھونٹ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام ازدواجی ضرورت کو اہمیت دیتا ہے اور غربت یا تنگدستی کے سبب ازدواجی سہولت فراہم نہ ہونے کی صورت میں اس فطری خواہش کو غیر فطری ذرائع سے دبانے یا کچلنے کی اجازت نہ دیتے ہوئے اس کے لیے زکوٰۃ کی رقم استعمال کرنے کی پوری اجازت دیتا ہے۔ [2]

---

[1] شرح خرشی علی متن خلیل ج ۲ ص: ۲۱۵۔
[2] حاشیہ مطالب اولی النھی، ج ۲ ص ۱۴۷۔

ابوعبید اس کے راوی ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے عاصم کا نکاح کیا اور ایک ماہ تک اسی مد سے ان کی کفالت کا نظم کیا۔ [1]

خلیفۂ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے منادی کو یہ حکم دے رکھا تھا کہ وہ ہر روز گلی کوچوں میں آواز لگائے، کوئی غریب ہے! کوئی یتیم یا مقروض ہے، کوئی ہے جسے شادی کے لیے روپیہ چاہیے۔ اس طرح آپ نے سب کو بے نیاز کر دیا۔ [2]

اس مضمون کی تائید حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں آپ نے فرمایا:

ایک شخص خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور عرض کیا: میں نے ایک انصاری عورت سے نکاح کیا ہے۔ (میں اس کا مہر ادا کرنا چاہتا ہوں) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مہر کیا ہے؟'' انصاری نے جواب دیا چار اوقیہ (تقریباً ساڑھے دس تولہ چاندی) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''چار اوقیہ! (اس قدر گراں مہر) کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ یہاں کوئی چاندی کا پہاڑ ہے جس میں سے چاندی تراش کر تمہارے حوالے کر دی جائے۔ (جاؤ) اس وقت ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ البتہ ہم تمہیں ایک جگہ بھیجیں گے۔ تمہاری مطلوبہ شئے وہاں تمہیں مل سکتی ہے۔'' [3]

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ شادی بیاہ کے لیے اس قسم کی امداد فرمایا کرتے تھے، اسی لیے صحابی آپ کے پاس آئے۔ پھر آپ نے انہیں یکسر محروم نہیں کیا۔ بلکہ ایسا جواب مرحمت فرمایا جس سے ان کی ڈھارس بندھی۔

☆ اسلام علم و دانش کی قدر کرتا ہے اور اہل علم اور دانشوروں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اسلام کی نظر میں علم و آگہی، ایمان و عمل کا سرچشمہ ہے۔ جس کے بغیر نہ ایمان میں استقامت آتی ہے، نہ عبادت میں لذت ملتی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

﴿هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ﴾ (۳۹/ الزمر: ۹)

---

[1] كتاب الأموال، باب فرض العطاء لأهل الحاضرة وتفضيلهم على أهل البادية، ص: ۲۳۲۔

[2] البداية والنهاية، فصل وقد كان منتظرًا فيما يؤثر من الأخبار، ج: ۹/ ۲۰۰۔

[3] نيل الاوطار، كتاب الصداق، باب جواز التزويج على القليل والكثير واستحباب القصد فيه، ج٦ ص: ۱۷۱۔

''بھلا جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے دونوں برابر ہو سکتے ہیں۔''

جاہلوں کے مقابلہ میں اہل علم کی برتری ثابت کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ ۝ وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّورُ ۝﴾

(۳۵/ فاطر:۱۹، ۲۰)

''اور اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں ہو سکتے اور نہ تاریکی اور روشنی''

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

((طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَىٰ كُلِّ مُسْلِمٍ)) [1]

''علم حاصل کرنا ہر مسلمان کا فریضہ ہے۔''

یہی وجہ ہے کہ علمائے اسلام نے محض عبادت کے لیے یکسو ہونے والوں کو زکوٰۃ کا مستحق نہیں گردانا، لیکن حصول علم کے لیے یکسو ہونے والوں کو زکوٰۃ دینے کی سفارش کی۔ اس کی علت یہی ہے کہ اسلام کی نظر میں تحصیل علم اور اس کے اندر امتیاز پیدا کرنے کے لیے جس قدر فراغت اور یکسوئی ضروری ہے، عبادت کے لیے اتنی ضروری نہیں۔ نیز اس لیے کہ عابد اپنی کشتی کو پار لگانے کی فکر میں ہوتا ہے، جبکہ باعمل عالم اپنے علم سے دوسروں کو بھی فائدہ پہنچاتا ہے۔ بنا بریں فقہائے اسلام کا فیصلہ ہے کہ مد زکوٰۃ سے دینی اور دنیاوی اہمیت کی حامل کتابیں اہل علم کے لیے خرید کرنا جائز ہے۔ [2]

زکوٰۃ کیسے دی جائے؟

زکوٰۃ کیسے دی جائے گی؟

''زکوٰۃ وہ اس طرح دیتے تھے'' اس عنوان کے تحت فقہا کے دو نظریے گزشتہ صفحات پر ذکر کیے گئے:

① غریبوں کو اتنا دیا جائے کہ تاعمر سوال کرنے کی حاجت نہ رہے۔

② یا اتنا دیا جائے کہ کم از کم سال بھر کے لیے انہیں کافی ہو۔

[1] المعجم الصغیر للطبرانی، باب الألف من إسمه احمد، ص: ١٦۔

[2] الانصاف، کتاب الزکاۃ، باب ذکر اھل الزکاۃ، ج ٣، ص: ١٩٧۔

دیکھنا چاہیے کہ ہر دو طریقوں میں کون سا طریقہ قابل عمل ہے۔ خصوصاً آج کے دور میں جب کہ ان پر عمل درآمد کے فیصلہ پر کوئی بھی اسلامی مملکت غور کر سکتی ہے۔ بظاہر محسوس ہوتا ہے کہ ہر نظریہ اپنی جگہ معقول اور مناسب عمل کا میدان رکھتا ہے، اس لیے کہ عام طور پر غریبوں کی بھی دو قسمیں ہیں:

☆ کچھ غریب، صنعت وحرفت، تجارت وزراعت، یا کسی اور ہنر سے واقف ہوتے ہیں، لیکن ضروری سامان جیسے اوزار، سرمایۂ کاشتکاری کے وسائل اور دیگر ذرائع ان کے پاس بالکل نہیں ہوتے۔ ظاہر ہے ان افراد کو اگر ان کے متعلقہ وسائل زکوٰۃ کی مد سے ایک مرتبہ حاصل ہو جائیں تو نہ صرف یہ کہ ان کے تمام دکھ درد کا مداوا ہوتا ہے بلکہ تاعمر دوبارہ زکوٰۃ لینے کی انہیں قطعی حاجت نہ ہوگی۔ آج کے دور میں عالمِ اسلام مد زکوٰۃ سے ایسے بڑے بڑے کارخانے کھول کر بآسانی اس منصوبے پر عمل کر سکتا ہے۔ جہاں مختلف سامان یا اوزار تیار کیے جائیں اور ہنرمند مگر غریب افراد میں مفت تقسیم کیے جائیں۔

☆ لیکن اس کے برعکس غریبوں کی بڑی تعداد اپاہج، نابینا، عمر رسیدہ، بیوہ، یا کم عمر بچوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ جو قطعی ناکارہ ہوتے ہیں۔ ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ سال بھر کے لیے کافی رقم ان کے حوالے کر دی جائے۔ یا اگر فضول خرچی یا لاپرواہی کا اندیشہ ہو تو ماہانہ یا ہر ہفتہ اس کے لیے کچھ وظیفہ مقرر کر دیا جائے، جس سے ان کی گزر بسر ہو سکے۔

موجودہ زمانے میں خاص طور پر اس طریقہ سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ یہ تقسیم میری اپنی دانست کا نتیجہ تھی، لیکن حیرت اور خوشی اس وقت ہوئی جب میں نے حنابلہ کی بعض کتابوں میں بڑی صراحت کے ساتھ اسی تقسیم کو درج پایا۔

چنانچہ غایۃ المنتہی اور اس کی شرح میں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ

"جس شخص کے پاس ہزاروں کی جائیداد ہو، لیکن خرچ اس سے زیادہ اور آمدنی کم ہو تو اسے بقدر ضرورت زکوٰۃ لینے میں مضائقہ نہیں، ایسے افراد

کے لیے امداد کا مناسب طریقہ یہ ہے کہ اگر وہ صنعت کار یا ہنر مند ہو تو ان
کے لیے ضروری اوزار اور مناسب وسائل مہیا کر دیئے جائیں، تاجر ہوں
تو معقول سرمائے کا بندوبست کیا جائے، لیکن اگر کوئی مفلس یا اپاہج ہو تو
ایسوں کو ہر سال امداد دینی ہوگی، اس لیے کہ زکوٰۃ بھی آخر سال بسال
واجب ہوا کرتی ہے۔'' [1]

☆ اوپر کی سطروں سے معلوم ہوا کہ زکوٰۃ اس کا نام نہیں کہ فقیروں کے ہاتھوں پر چند سکے رکھ دیئے جائیں بلکہ زکوٰۃ دینے کا منشا یہ ہے کہ لینے والا امداد پا کر خود کفیل بن جائے اور معیاری زندگی بسر کرنے کے لائق ہو جائے۔ چنانچہ انصاف اور خیر امت کا تقاضا ہے کہ ہر آدمی کو مع اہل وعیال دو وقت کی روٹی نصیب ہو۔ تن ڈھانکنے کے لیے لباس اور سر چھپانے کے لیے مناسب مکان اس کے پاس مہیا ہو، علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے (المحلی) میں اور امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب (المجموع) میں اور بیشتر دوسرے علما نے اپنے طور پر اس ...... کی تائید کی ہے امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، ہر شخص کے حسب حال مناسب معیار زندگی ...... جس کے بغیر آدمی فقیروں کے زمرے میں شامل ہوتا ہے، چہ جائیکہ مسکین جو فقیر سے قدرے بہتر ہوتا ہے...... یہ ہے کہ اس کے اور اس کے اہل وعیال کے لیے میانہ روی کے ساتھ خورد ونوش لباس اور جملہ لوازم کے ساتھ رہائش کے لیے مکان مہیا ہو۔ [2]

فی زمانہ بچوں کے لیے دینی وعصری تعلیم بھی اشد ضروری ہے، تاکہ آئندہ نسلیں جہالت کی تاریکی سے دور پاکیزہ اور باوقار زندگی گزار سکیں اور دین ودنیا کے تقاضوں سے بحسن وخوبی عہدہ برآ ہو سکیں۔

اس میں شک نہیں کہ فقہا نے مسلمانوں کی بنیادی ضرورتوں کے تحت جہاں علوم و فنون کی تحصیل کا ذکر کیا ہے، وہیں مناسب دوا اور معقول علاج کی ضرورت کا بھی احساس دلایا ہے، اس لیے کہ مریض کو بیماری کے رحم وکرم پر چھوڑ دینا انسانیت نہیں کھلی ہوئی مردم

---

[1] مطالب اولی النھیٰ، ج۲ ص: ۱۳۶۔ [2] المجموع شرح المھذب، کتاب الزکاۃ، باب فی قسم الصدقات، ج٦ ص: ۱۹۱۔

کشی ہے، حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

''لوگو! علاج میں کوتاہی نہ کرو، اس لیے کہ جس نے مرض پیدا کیا، اس نے اس کی دوا بھی پیدا کی ہے۔'' [1]

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ (۲/ البقرة:۱۹۵)

''اور اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔''

﴿وَلَا تَقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا﴾ (٤/ النسآء:٢٩)

''اور آپس میں ایک دوسرے کو قتل نہ کرو، بے شک اللہ تمہارے حال پر مہربان ہے۔''

نیز حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

''مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہوتا ہے، نہ اس پر زیادتی کرتا ہے، نہ اسے بے یار ومددگار چھوڑتا ہے۔'' [2] مصیبت یا بیماری میں کسی کی مدد نہ کرنا بدترین اخلاقی جرم ہے۔ چونکہ ملکوں اور قوموں کا مزاج اور زمانے کے حالات ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہتے۔ اس لیے غریبوں کے لیے امداد کی ایسی کوئی حد مقرر نہیں کی جا سکتی، جو ہر زمانے اور ہر ملک کے لیے یکساں قابل قبول ہو۔ بنا بریں گزشتہ صفحات میں جو اعداد وشمار پیش کیے گئے، ان کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ معاشرہ پوری طرح بیدار رہے اور دیگر مسائل کی طرح زکوٰۃ کی ادائیگی میں کسی جمود یا غفلت کا شکار نہ رہے۔

زکوٰۃ کے اثرات

غریبوں کی ہر ممکنہ امداد اور ان کی سینکڑوں ضرورتوں میں زکوٰۃ کا معقول استعمال فکر ونظر کو یہ احساس دلاتا ہے کہ غریبوں کے لیے زکوٰۃ وہ سالانہ اور مستقل امداد ہے، جسے پا

[1] بخاري، كتاب الطب، باب ما انزل الله داءً ا لّا انزل له شفاء، رقم: ٥٦٧٨؛ ابوداود، كتاب الطب، باب الرجل يتداوى، رقم: ٣٨٥٥؛ ترمذي، كتاب الطب، باب ما جاء في الدواء والحث عليه، رقم: ٢٠٣٨۔ [2] بخاري، كتاب المظالم، باب لا يظلم المسلم المسلم، رقم: ٢٤٤٢۔

کر فقیر اور مسکین، بھوک اور افلاس کی سرحدوں کو عبور کر سکتے ہیں۔ اپاہج اور بے نوا آلام و مصائب کے مہیب غاروں سے نکل کر سکھ اور چین کی پرسکون وادی میں قدم رکھ سکتے ہیں اور اسی کے سہارے بے روزگار اپنی بیکاری کے دنوں کو خیر باد کہہ سکتے ہیں۔

انسانی ضمیر کو اس لمحہ سے زیادہ فرحت اور مسرت کب ہوگی؟ جس لمحہ پیار و محبت کے ہاتھوں مالی امداد پا کر کسی خانہ خراب کا گھر آباد اور کسی کا ٹوٹا ہوا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔

آیئے! مصیبت کے مارے کسی ایسے فرد بشر کے ساتھ ہم بھی کچھ دور چلیں، جس کے قدم غربت اور افلاس کی تاریکی سے نکل کر فراخ دستی اور فارغ البالی کی طرف بڑھ رہے ہوں، تا کہ محبت کا یہ لمحہ ہم بھی دیکھ سکیں۔

یہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ہیں۔ اسلام کے مایہ ناز فرزند اور ایک عظیم مملکت کے خلیفۂ دوم، تیز دھوپ اور ٹھیک دوپہر کا وقت ہے، لیکن ایک درخت کے سائے میں فرشِ خاک پر لیٹے ہوئے ہیں۔ دور سے آنے والی دیہات کی ایک سیدھی سادی عورت قریب پہنچ کر خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ان کا پتہ پوچھ رہی ہے اور پھر روانی میں کہنا شروع کرتی ہے، میں بال بچوں والی غریب دیہاتی عورت ہوں، امیر المومنین نے محمد بن مسلمہ کو زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کے لیے ہمارے علاقے میں بھیجا تھا، وہ آئے بھی، مگر افسوس! انہوں نے ہمیں کچھ نہ دیا۔ خدا آپ کا بھلا کرے، میری آپ سے بس اتنی گزارش ہے کہ ان کے سامنے ہماری سفارش کر دیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے غلام یرفا سے محمد بن مسلمہ کو حاضر ہونے کے لیے کہہ رہے ہیں۔ عورت سہم جاتی ہے، کہتی ہے، انہیں بلانے کی بجائے کسی سے کہلوا دیں۔ یا خود میرے ساتھ بنفس نفیس چلنے کی زحمت فرمائیں، اس طرح شاید میرا کام بن جائے، گویا اسے ڈر ہے کہ کہاں ایک تحصیلدار اور کہاں ایک دیہاتی عورت؟ اتنے بڑے مرتبے کا آدمی کب کسی کو خاطر میں لا سکتا ہے؟ لیکن اب تک عورت کو یہ علم نہ تھا کہ یہی حضرت عمر ہیں، حضرت عمر اسے تسلی دیتے ہیں، اتنے میں محمد بن مسلمہ آ جاتے ہیں اور امیر المومنین السلام علیکم کہہ کر ایک طرف زمین پر بیٹھ جاتے ہیں، تب کہیں عورت کو معلوم ہوتا

ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہی ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بڑے درد بھرے لہجے میں کہنا شروع کرتے ہیں:

''محمد بن مسلمہ! خدا گواہ ہے، میں نے تمہارے بارے میں پورا پورا اطمینان کر لینے کے بعد اس منصب کو تمہارے حوالے کیا تھا۔ مگر افسوس! نتیجہ برعکس نکلا، بھلا بتاؤ کل خدا اس عورت کے بارے میں پوچھے گا تو تم یا میں کیا جواب دیں گے۔ محمد بن مسلمہ آبدیدہ ہوتے ہیں، آپ فرماتے ہیں، خدا نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اور نبی نے خلیفۂ اول ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو یہ ذمہ داری سونپی اور اب یہ ذمہ داری میرے سر آئی، میں نے تمہیں کچھ سوچ کر اس مقام پر فائز کیا، یاد رکھو! آیندہ اگر اس منصب پر رہے اور تمہاری گزر اس عورت پر ہو تو اسے سال بھر کے لیے خرچ دینے کے ساتھ گزشتہ سال کا خرچ بھی ضرور دو، لیکن ٹھہرو، نہ جانے تمہارا گزر کب ہو؟ پھر آپ نے ایک اونٹنی، کچھ آٹا اور روغن منگوا کر اسے مرحمت فرمایا اور کہا کسی قافلے کے ساتھ خیبر چلی جاؤ، جہاں تمہارا گھر ہے، ایک ضرورت کے تحت میں بھی خیبر آ رہا ہوں...... اگلے روز جب آپ وہاں پہنچے تو آپ نے اسے مزید دو اونٹنیاں عطا فرمائیں اور روزمرہ کی ضرورتوں کے لیے اور بھی کچھ سامان اسے دیا۔ [1]

ہمیں دیکھنا چاہیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کتاب زندگی کا یہ ایک واقعہ ہماری کس طرح رہنمائی کرتا ہے۔ یہ واقعہ بتاتا ہے کہ مسلمان حکمرانوں کو رعایا کے دکھ درد کا احساس کس قدر بے چین کر دیتا ہے۔

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ غریب طبقہ کو معاشی بحران سے نجات دلانے کی اگر کوئی گارنٹی یا ضمانت دی جا سکتی ہے تو اس میں شک نہیں کہ وہ صرف زکوٰۃ کے ذریعہ دی جا سکتی ہے۔ اس لیے کہ یہی وہ مستقل امداد ہے جس کے بروقت نہ ملنے پر غریبوں کو حاکم وقت کے سامنے فریاد کرنے کی بھی اجازت ہوتی ہے۔

نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اس بات کے قائل تھے کہ زکوٰۃ

[1] كتاب الاموال، باب قصة عمر مع اعرابية شكت اليه محمد بن مسلمة فى الصدقة ص:٥٩٩۔

اتنی دینی چاہیے جو لینے والے کو آسودہ اور بے نیاز کر دے اور یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ذاتی اختراع نہیں تھی، آپ کو یقین تھا کہ یہ طرز عمل ان کے حبیب ﷺ اور ان کے پیش رو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا پسندیدہ طریقہ تھا۔

زکوٰۃ اور ٹیکس

زکوٰۃ کی فراہمی اور اس کی تقسیم کا اسلامی نظام، عدل و مساوات، حکمت عملی اور مآل اندیشی کا بے نظیر مرقع ہے۔ جس کے دسویں حصے تک رسائی کسی جدید سے جدید معاشی نظام کے لیے بعید از قیاس ہے، لیکن کس قدر ستم ظریفی ہے کہ موجودہ زمانے کے کسی معاشی فلسفے کو محض اس لیے مرعوبیت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے کہ اس پر یورپ کی چھاپ لگی ہوتی ہے جب کہ اس کی تہہ میں خرابی اور ناکامی کے سیاہ داغ پڑے ہوتے ہیں۔

ٹیکس کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ جو زکوٰۃ کے مقابل ایک نظام ہے جس کی داغ بیل یورپ میں پڑی، تاریخ شاہد ہے کہ اقوام عالم اور قدیم یورپ میں عرصے سے اس کا رواج رہا، لیکن زکوٰۃ اور ٹیکس کے درمیان جو فرق ہے اور کون سا نظام، عوام کے جذبات کو اپیل کرنے کی کہاں تک اہلیت رکھتا ہے...... ایک سرسری جائزے سے اس کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

① زکوٰۃ کی خصوصیات میں سب سے نمایاں اور پر اثر خصوصیت ایمان اور احتساب کا وہ جذبہ ہے جس سے موجودہ حکومت کا ظالمانہ یا عادلانہ سبھی ٹیکس پورے طور پر محروم ہیں، بلکہ زکوٰۃ کے برعکس ان میں ناراضگی گرانی اور بددلی کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ٹیکس دینے والا یہ عقیدہ نہیں رکھتا کہ یہ ٹیکس خدا کی طرف سے مقرر کیا گیا ہے اور اس پر اسے اجر ملے گا، بلکہ وہ یہ جانتا ہے کہ یہ ٹیکس لگانے والے اسی کے جیسے انسان ہیں اور شاید اس سے بھی زیادہ ہیچ اور ہیچ ہیں، پھر اس سے حاصل شدہ آمدنی زیادہ تر رنگ رلیوں پر اپنے اقتدار کے محفوظ رکھنے پر یا چند اشخاص اور مخصوص پارٹیوں کے مفاد پر خرچ ہوتی ہے۔ مزید برآں ان ٹیکسوں کے ساتھ افہام و تفہیم کی قوت کی بجائے جرمانے کی دھمکیاں، سزائیں اور

خشک وسخت قوانین ہوتے ہیں جن سے عوام میں ناراضگی اور بے چینی بڑھتی جاتی ہے۔

② زکوٰۃ اور ٹیکس کے درمیان دوسرا نمایاں فرق یہ ہے کہ زکوٰۃ دولت مندوں سے لے کر وہیں کے غریبوں میں تقسیم کر دی جاتی ہے، لیکن اس کے بالمقابل شخصی یا عوامی حکومتوں کے ٹیکسوں کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ یہ ٹیکس زیادہ تر متوسط طبقے اور غریبوں سے زیادہ وصول کیے جاتے ہیں اور مالداروں اور کھاتے پیتے لوگوں کی طرف لوٹا دیے جاتے ہیں۔ چنانچہ ہر کوئی دیکھ سکتا ہے کہ یہ دولت جو کسانوں کے گاڑھے پسینے کی کمائی اور مزدوروں، کاریگروں اور تاجروں پر لگائے گئے ٹیکس سے حاصل ہوتی ہے، انتہائی بے دردی اور بے رحمی کے ساتھ گورنروں، وزیروں اور ان کے شاہانہ ٹھاٹ باٹ پر لٹا دی جاتی ہے۔ اس سے جو باقی بچتا ہے، وہ راجدھانیوں کی نوک پلک سنوارنے، سڑکوں کو کشادہ کرنے، ٹاؤن اور پارکوں کو بنوانے پر خرچ کیا جاتا ہے، تاکہ راج سنگھاسن پر بیٹھنے والوں، ان کے درباری خوشامدیوں اور مزدوروں اور غریبوں کا استحصال کر کے مالدار بننے والوں کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں، لیکن دوسری طرف اس عیش وعشرت سے کوسوں دور گندی بستیوں اور بوسیدہ جھونپڑیوں میں وہی محنت کش مزدور موت وحیات کی کش مکش میں گرفتار ہوتے ہیں، جن کے نحیف وناتواں کاندھوں پر بھاری بھاری ٹیکس لاد کر عیش وعشرت کے ان محلوں کی تعمیر ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے موجودہ ٹیکسوں کی اس سے زیادہ بہتر تعریف اور کیا ہو سکتی ہے کہ یہ ٹیکس غریبوں سے لے کر امیروں کو دے دیا جاتا ہے۔

غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ زکوٰۃ کی روح خدا کا خوف واطاعت اور غریبوں کے حال پر غمخواری اور شفقت ہے، جب کہ ان ٹیکسوں میں خدا کی معصیت، دل کی سختی، حد سے بڑھی ہوئی حرص اور غریبوں کی ضرورتوں اور ان کے فقر وکمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی زبردست خواہش ہے۔ زکوٰۃ کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس سے ہمدردی وغمخواری کی روح عام ہوتی ہے، معاشرے میں خوشحالی نظر آتی ہے، مالوں میں برکت اور دلوں میں الفت پیدا ہوتی ہے۔ ایک دوسرے پر اعتماد اور بھروسہ کی فضا قائم ہوتی ہے، لیکن زکوٰۃ کے

سوا دوسری سب چیزوں میں ان اوصاف میں سے کچھ بھی نہیں پایا جاتا۔

مقامی تقسیم پر زور

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی روایت گزر چکی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو یمن روانہ کرنے سے قبل ہدایت فرمائی تھی، وہاں کے مالداروں سے زکوٰۃ وصول کرو، اور وہیں کے غریبوں اور مسکینوں میں تقسیم کرو۔

اس ارشاد کے بموجب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے یمن والوں سے زکوٰۃ وصول فرمائی اور چن چن کر یمن کے غریبوں میں اسے تقسیم فرمایا اور تاحیات نہ صرف اپنا معمول بنالیا، بلکہ اپنے بعد والوں کے لیے یہ دستور قرار دیا کہ ''ترک مستقر کرنے پر، عشر اور زکوٰۃ کی رقم، نئے مستقر سے وصول کی جائے گی اور وہیں کے غریب باشندوں میں تقسیم کردی جائے گی۔[1]

ابو جحیفہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تحصیلدار ہماری بستی میں آئے، مالداروں سے زکوٰۃ لے کر انہوں نے وہیں غریبوں میں تقسیم کردی۔ میں یتیم تھا اس لیے مجھے ایک اونٹنی ملی۔

صحیح کی روایت ہے کہ ایک اعرابی نے سوال کیا، اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا اللہ نے آپ کو مالداروں سے زکوٰۃ لے کر غریبوں کو دینے کا حکم دیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں!''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد آنے والے خلیفہ کو بادیہ نشین عربوں کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین فرمائی۔ اس لیے کہ وہی خالص عرب اور اسلام کا اصل سرمایہ ہیں۔ دوسرے یہ فرمایا کہ جس جگہ کے مالداروں سے زکوٰۃ وصول کی جائے، وہیں کے غریبوں میں تقسیم کردی جائے۔[2]

اس تاکید کا نتیجہ تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں آپ کے تحصیلدار ہاتھ

---

[1] نیل الأوطار، کتاب الزکاۃ، باب الحث علیها والتشدید فی منعها، ج ٤ ص: ١٢٢۔
[2] کتاب الاموال، باب قسم الصدقة فی بلدها وحملها الی بلد سواہ، ص: ٥٩٥۔

میں لاٹھی اور کندھے پر وہی بوریہ رکھے واپس آتے، جو زکوٰۃ کی وصولی کے لیے روانگی کے وقت وہ اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ حضرت سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے بارے میں بتایا کہ بنوسعد یا بنوذبیان کی زکوٰۃ انہوں نے وہیں تقسیم کی، اور خالی بوریہ لیے واپس آئے۔ (ص ۵۹۶) دورِ فاروقی کے ایک تحصیلدار یعلیٰ بن امیہ کے ساتھیوں کا بیان ہے کہ ہم درہ لیے زکوٰۃ کی وصولی پر نکلتے اور وہی درہ لے کر گھر لوٹتے۔ (ص ۵۱۷)

اور یہی روش جس کی تلقین، ارشاداتِ نبوی، خلفائے راشدین کی سیرت اور صحابہ وتابعین کے فتاویٰ میں جابجا موجود ہے، عرصہ دراز تک بنوامیہ کے خال خال تحصیلداروں میں موجود تھی۔

چنانچہ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ زیاد بن ابیہ، یا کسی اور اموی حاکم نے آپ کو تحصیلدار بنا کر کسی علاقے میں بھیجا، جب آپ لوٹ کر واپس آئے تو حاکم نے حیرت سے سوال کیا، کیوں! وصول شدہ مال کہاں چھوڑ آئے؟ حضرت عمران نے اسی لہجے میں فرمایا، تو کیا تم نے مال جمع کرنے کے لیے مجھے بھیجا تھا۔ (سنو!) جہاں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ کی وصولی کا حکم فرمایا تھا، میں نے وہاں سے وصول کیا اور جس جگہ آپ نے تقسیم کا حکم دیا تھا وہیں میں نے تقسیم کر دیا۔ [1]

زکوٰۃ کے اس طریقۂ تقسیم کی تائید کرتے ہوئے ابوعبید نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ پڑوس اور ہم وطنی کی وجہ سے ہر بستی کے غریب اس بستی کے مالداروں کے زیادہ مستحق ہیں۔ [2]

اور اگر بستی والوں کی ضرورت تھی، لیکن محض نادانستگی میں تحصیلدار نے وہاں کی

---

[1] ابوداود، کتاب الزکاۃ، باب فی الزکاۃ ھل تحمل من بلد الی بلد، رقم: ۱۶۲۵؛ ابن ماجہ، کتاب الزکاۃ، باب فی عمال الصدقۃ، رقم: ۱۸۱۱؛ نیل الاوطار، کتاب الزکاۃ، باب تفرقۃ الزکاۃ فی بلدھا ومراعاۃ المنصوص، علیہ لا القیمۃ وما یقال عند دفعھا، ج۲ ص: ۱۵۶۔

[2] کتاب الاموال، باب توزیع عمال عمر الصدقات علی فقراء بلدھا، ص: ۵۹۸۔

زکوٰۃ کہیں اور پہنچا دی تو زکوٰۃ کی رقم دوبارہ اسی بستی میں لوٹا دی جائے گی۔ چنانچہ سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کا یہی فتویٰ تھا اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ اسی پر عمل کرتے تھے۔ (ایضاً)

البتہ امام نخعی رحمۃ اللہ علیہ اور حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے دوسری بستی کے زیادہ محتاج عزیزوں کے لیے اشخاص کو منتقلی کی اجازت دی ہے۔ بقول ابوعبید یہ خصوصی اجازت ہے۔ ابوالعالیہ کے قول کی بھی یہی توجیہ کی گئی۔ ہاں اگر مقامی ضرورت ہو تو زکوٰۃ کی اجتماعی منتقلی بھی جائز ہے۔ خواہ فرد واحد منتقل کرے یا حاکم، چنانچہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت سحنون رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اگر کسی بستی کے لوگ حاجت مند ہوں اور حاکم ان کی ضرورت سے واقف ہو تو زکوٰۃ کی رقم دوسری بستی میں بھیجی جا سکتی ہے۔ [1]

ہمہ گیر سماجی کفالت

زکوٰۃ کے سلسلے میں اسلام کی متعدد اصلاحات کا مطالعہ اس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ غریبوں کے لیے منظم اور جماعتی طور پر اگر کوئی نظم ہو سکا تو وہ یہی زکوٰۃ ہے۔ جس کی جمع و تقسیم کا سارا کام ذاتی اور اختیاری خیرات کی بجائے حکومتی سطح پر عمل میں آتا ہے اور جس کی برکتوں کا یہ عالم ہے کہ بے شمار غریب کھانا، کپڑا اور سر چھپانے کی جگہ پاتے ہیں۔ بیماروں کو دوائیں اور ضرورت مندوں کو ضروریات کی چیزیں مل جاتی ہیں اور اس طرح غریبوں اور مفلسوں کی پوری بستی سکھ چین کا سانس لیتی ہے اور مسلمانوں کے ساتھ ساتھ وہ افراد بھی اس سے مستفید ہوتے ہیں جو اسلامی مملکت میں پناہ حاصل کر لیتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ کسی معاشرے یا پوری برادری کی اس گہرائی اور گیرائی کے ساتھ پرورش اور کفالت، اسلام کی اعلیٰ ترین خصوصیت ہے، جس کی طرف اسلام نے نہ صرف پیش قدمی کی، بلکہ نظریہ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی نظیریں بھی پیش کیں اور آج دنیا خود فیصلہ کر سکتی ہے کہ اسلام نے جو کچھ کیا، پورے خلوص، للّٰہیت اور انسانیت کے ساتھ کیا، جبکہ اس کے برعکس جس نے اس مسئلے کو ہاتھ لگایا، کوئی نہ کوئی خودغرضی یا مفاد پرستی

[1] كتاب الزكاة، باب فى اخراج الزكاة من بلد الى بلد ،ج ١ ص: ٢٨٧۔

اس کے مدنظر رہی، پھر توجہ کی یہ زحمت اس وقت گوارا کی گئی، جب ان کے خلاف تحریکیں چلائی گئیں، انقلاب کے نعرے بلند کیے گئے، یہاں تک کہ جنگ کے شعلے بھڑکائے گئے، تب انہیں احساس ہوا کہ انقلاب ناگزیر ہے اور مسئلہ کا حل تلاش کرنے کے سوا چارہ نہیں۔

چنانچہ یورپ کی طرف سے کسی سماجی کفالت یعنی افرادی پرورش کا سب سے پہلا سرکاری اعلان ہمیں ۱۹۴۱ء کے اٹلانٹک چارٹر میں نظر آتا ہے، جو دراصل انگلستان اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کا مشترکہ بیان تھا، اس بیان میں اس فیصلے کو دہرایا گیا تھا کہ

''سماج کی مشترکہ باڈی اپنے افراد کی کفالت اور نگہداشت کی ذمہ دار ہے۔'' [1]

حیرت یہ ہے کہ ان کی آنکھیں آج کھلیں، جبکہ اسلام نے صدیوں پہلے افراد کی اجتماعی سرپرستی کے کامیاب تجربے کیے اور اس کے لیے پورا ایک نظام برپا کیا۔ مزید حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ بعض اہل قلم تمام تر ترقیات اور فتح وظفر کا سہرا بس یورپ کے سر باندھنا چاہتے ہیں، لیکن اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ اور روایات پر منوں مٹی ڈال کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اس قسم کا بس ایک نمونہ بطور مثال ہم یہاں پیش کرتے ہیں:

۱۹۵۲ء میں یورپ کے مختلف ملکوں کی ایک انجمن نے ''سماجیات'' کے موضوع پر ایک کانفرنس منعقد کی، کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے مسٹر ڈانیل ایس جارج نے سماج کی بدلتی ہوئی ذمہ داریوں پر تقریر کرتے ہوئے کہا:

''قدیم زمانے میں سماج کا غریب طبقہ بھیک مانگنے اور خیرات جمع کرنے پر خود کو مجبور پاتا تھا۔ اس لیے کہ ان کی کفالت اور سرپرستی کا اجتماعی نظم نہ تھا، ہاں سترہویں صدی میں اس راہ میں پہلا قدم یہ اٹھایا گیا کہ لوگوں نے اپنے طور پر جگہ جگہ انجمنیں بنائیں اور محلّہ محلّہ غریبوں کو امداد بہم پہنچائی۔'' [2]

غور کیجیے کہ اس زبردست مغالطے اور فریب کی اصل علت اسلامی تاریخ اور اس کے نظام زکوٰۃ سے جہالت کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے؟ جبکہ گزشتہ صفحات پر تفصیل سے بتایا جا چکا ہے کہ سماج یا افراد کی کفالت اور سرپرستی کا اجتماعی نظم سترہویں صدی سے بہت پہلے اور

---

[1] سماجی کفالت: ص: ۱۲۶۔ [2] حلقه الدراسات الاجتماعيه، ص: ۲۱۷۔

لوگوں کی نجی انجمنوں سے کہیں زیادہ منظّم اور اعلیٰ پیمانے پر اسلام کر چکا ہے اور اس کو فرض کا درجہ دیگر دین وایمان کے لیے اشد ضروری بتایا ہے۔ مسٹر جارج نے آگے چل کر کہا:

''غریبوں کی امداد کے قدیم اور جدید طریقوں کا موازنہ کرنے کے بعد ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ امداد کا موجودہ طریقہ بڑی حد تک تسلی بخش اور مکمل ہے، اس لیے کہ پہلے کی بہ نسبت آج کا سماج صرف غریبوں کی امداد نہیں کرتا، بلکہ ان کے سوا باقی افراد کو بھی امداد پہنچاتا ہے اور رنگ، نسل یا مذہب کا لحاظ نہیں کرتا، لیکن یہ بھی نہ سمجھنا چاہیے کہ آج کا ترقی یافتہ معاشرہ آنکھ بند کر کے ہر کسی کی مدد کر دیتا ہے، بلکہ اس کے کچھ اصول اور ضابطے ہوتے ہیں، جس کی وہ سختی سے پابندی کرتا ہے۔

① چنانچہ وہ دیکھتا ہے کہ لینے والا واقعی مستحق ہے یا نہیں۔

② دوسرے وہ جو کچھ دیتا ہے اسے امداد نہیں، بلکہ تعاون سمجھتا ہے، تا کہ لینے والا خود کو فروتر نہ سمجھے۔

③ تیسرے یہ کہ تعاون وہ کچھ اس طرح کرتا ہے، جس کی وجہ سے لینے والے کو در بدر کی ٹھوکریں نہیں کھانی پڑتیں، نہ ہی شرم وننگ کا اسے کوئی احساس ہوتا ہے۔ (ایضاً)

مسٹر جارج کے ان تازہ انکشافات کو پڑھنے والا اگر اسلامی تاریخ سے ناواقف ہے تو وہ شوق سے اسے انکشاف کہہ سکتا ہے، لیکن ہم ایسا سمجھنے سے قاصر اسی لیے ہیں کہ زکوٰۃ سے متعلق اسلامی تعلیمات کا تھوڑا سا مطالعہ کرنے والا بھی سمجھ سکتا ہے کہ یورپ، اسلام کے سماجی نظام کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ چنانچہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ شریعت کی رو سے یہ ایک طے شدہ حق ہے اور حق بھی ایسا کہ دینے والا لینے والے پر کوئی احسان نہیں جتلا سکتا، نہ اسے کسی قسم کی اذیت کے درپے ہو سکتا ہے۔ نیز اس کی جمع وتقسیم اور اس کا سارا نظم حکومت کرتی ہے۔ ہر کم آمدنی اور ناکافی آمدنی والا اس کا مستحق ہے اور محض اسی ایک ذریعہ سے اسلام غریبوں کو بالکلیہ زائل کرتا ہے اور انہیں مالداروں سے قریب کرتا ہے اور اب ہمیں یہ کہنے میں باک نہیں کہ یورپ کو اس سے بہتر سماجی نظام بس خواب میں نظر آ سکتا ہے۔

☆...... رواداری

☆...... جوابدہی کا تصور

چوتھا ذریعہ......اسلامی بیت المال

زکوٰۃ......جیسا کہ پہلے بتایا گیا......اسلام میں غریبی کا تیسرا اور مالی اعتبار سے پہلا علاج ہے، لیکن قدرے اضافے کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی حکومت کا سرکاری خزانہ جس کی ایک مستقل آمدنی زکوٰۃ ہے، اپنے دیگر مستقل ذرائع کے ساتھ، غریبی کو ہٹانے کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے، یہ اس لیے کہ اسلامی حکومت کی جملہ املاک اور بیت المال کے تمام ذرائع محتاج اور بے کس افراد کے لیے وقف ہوتے ہیں۔ خصوصاً ایسے حالات میں ان کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے۔ جبکہ زکوٰۃ کی مد ان کے لیے ناکافی ہوتی ہے اور ان کی ضرورت بدستور باقی رہتی ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ زکوٰۃ کے مصارف مخصوص ہوتے ہیں اور بیت المال کے دیگر ذرائع سے دوسرے لوگ بھی فیضیاب ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:

﴿ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ ...... ﴾ (۵۹/ الحشر:۷)

"جو مال اللہ نے اپنے پیغمبر کو بستیوں والوں سے دلوایا وہ اللہ اور پیغمبر اور ان کے قرابت داروں اور یتیموں اور مسافروں کے لیے ہے، تاکہ جو لوگ تم میں دولت مند ہیں یہ مال ان ہی میں نہ گھومتا رہے۔"

﴿ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا ...... ﴾ (۸/ الانفال:۴۱)

"اور جان لو کہ جو شئے کفار سے بطور غنیمت تم کو حاصل ہو تو اس کا حکم یہ ہے کہ کل کا پانچواں حصہ اللہ کا اور اس کے رسول کا ہے اور ایک حصہ یتیموں کا اور ایک غریبوں کا اور ایک حصہ مسافروں کا ہے۔"

اس میں شک نہیں کہ اسلامی تعلیمات کے ماہرین نے زکوٰۃ کے استعمال میں سخت احتیاط کی تاکید کی ہے اور اس بات کی اجازت نہیں دی کہ زکوٰۃ یا اس کی معمولی سی رقم فوجیوں کی تنخواہ یا کسی اور مد میں خرچ کی جائے، البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ اگر حکومت کے پاس دوسرا بجٹ نہ ہو اور صرف زکوٰۃ کے بجٹ میں روپیہ موجود ہو تو اس صورت میں زکوٰۃ کے

بجٹ سے حسب ضرورت قرض لیا جائے گا اور بعد میں اسے لوٹا دیا جائے گا اور اگر کسی مسلمان کو کوئی ضرورت ہو، اور بیت المال میں زکوٰۃ کی رقم نہ ہو تو امام کو چاہیے کہ خراج کی مد سے اس کی امداد کرے اور اسے قرض شمار نہ کرے، اس لیے کہ یہ کہا جا چکا ہے کہ خراج اور اس قبیل کی دیگر رقمیں مسلمانوں پر بھی خرچ کی جا سکتی ہیں۔ [1]

بخاری اور مسلم نے حضور ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((أَنَا أَوْلٰى بِكُلِّ مُسْلِمٍ مِنْ نَفْسِهٖ مَنْ تَرَكَ مَالًا فَلِوَرَثَتِهٖ وَ مَنْ تَرَكَ دَيْنًا أَوْ ضِيَاعًا فَإِلَيَّ وَعَلَيَّ)) [2]

''ہر مسلمان کا (حقیقی) سرپرست میں ہوں، یاد رکھو، جس نے ترکے میں دولت چھوڑی وہ اس کے وارث کی ہوگی، لیکن جو اس حال میں مرا کہ اس کے ذمہ قرض ہے، یا اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں تو ان کی کفالت اور نگہداشت میرے ذمہ ہوگی۔''

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں مالک بن اوس سے روایت کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تین باتوں پر عموماً قسم کھاتے تھے:

① خدا کی قسم! نہ بیت المال میرا ہے، نہ کسی اور کا۔

② بخدا! سب مسلمان اس مال میں برابر کے شریک ہیں۔

③ خدا کی قسم! اگر زندگی نے میرا ساتھ دیا تو میں صنعاء (یمن کے ایک شہر) کی پہاڑی پر موجود چرواہے کو اس کا حق پہنچاؤں گا۔ بقول امام شعرانی رحمۃ اللہ علیہ:

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ اثر اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ حاکم وقت اور رعایا میں

---

[1] مبسوط سرخسي، ص ١٨۔ ج ٣۔ [2] بخاري، كتاب التفسير، تفسير سورة الأحزاب، باب ﴿النَّبِيُّ أَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ﴾ رقم: ٤٧٨١؛ مسلم، كتاب الفرائض، باب من ترك مالاً فلورثته، رقم: ٤١٥٩؛ ابوداود، كتاب الخراج والفيء والأمارة، باب في قسم الفيء، رقم: ٢٩٥٦؛ ترمذي، كتاب الفرائض، باب ما جاء في من ترك مالاً فلورثته، رقم: ٢٠٩٠؛ ابن ماجه، كتاب السنة، باب اجتناب البدع والجدل، رقم ٤٥؛ دارمي، كتاب البيوع، باب في الرخصة في الصلاة عليه، رقم: ٢٥٩٤؛ نسائي، كتاب الجنائز، باب الصلاة على من عليه دين، رقم: ١٩٦٥؛ مسند احمد: ٣/ ٣١١، رقم: ١٣٩٢٤۔

کوئی فرق نہیں اور ہر مسلمان بیت المال سے امداد کا حقدار ہے۔ (نیل الاوطار ج ۸ ص ۸۹)

رواداری

پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ بیت المال سے غریب مسلمان ہی نہیں مستفید ہوتے، بلکہ ان کے علاوہ وہ غیر مسلم جو ذمی کہلاتے ہیں اور اسلامی زندگی کے زیر سایہ زندگی گزارنے کا عہد کئے ہوتے ہیں، ان کا بھی حق ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے بیت المال سے فیض یاب ہوں۔ چنانچہ امام یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الخراج میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے اس معاہدے کو بعینہٖ نقل کیا ہے۔ جو ان کے اور حیرہ کے باشندوں کے درمیان عراق میں ہوا تھا۔ حیرہ کے یہ باشندے عیسائی تھے، یہ سیاسی معاہدہ اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ تنگدستی، بیماری یا بڑھاپے کے خلاف مسلمان اس قوم کے ساتھ مکمل تعاون کی ذمہ داری اپنے اوپر عائد کرتے ہیں۔ اسلامی تاریخ میں اپنی نوعیت کی پہلی سماجی گارنٹی تھی، جو اسلامی افواج کے سالار حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اس قوم کو دی تھی، جس نے اپنے مذہب پر برقرار رہنے کو پسند کیا تھا۔

اسلامی رواداری کا آئینہ دار یہ معاہدہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ان الفاظ میں قلم بند کیا گیا۔ اس کی ایک دفعہ ذیل میں درج ہے:

"اسلامی افواج کے سالار کی حیثیت سے میں اقرار کرتا ہوں کہ حیرہ کا جو باشندہ بڑھاپے، بیماری یا کسی اور وجہ سے اس حد تک معذور ہو جائے کہ اسے بھیک مانگنا پڑے تو اس سے وصول کیا جانے والا جزیہ (سالانہ ٹیکس) معاف کر دیا جائے گا اور اس کے اخراجات، اسی طرح اس کے اہل وعیال کی جملہ ضروریات، بیت المال سے پوری کی جائیں گی، بشرطیکہ یہ شخص دارالاسلام میں اپنی سکونت برقرار رکھے، لیکن اگر یہ شخص دارالاسلام سے نکل کر کسی ایسے علاقے میں آباد ہوا، جن سے ہم برسر پیکار ہوں تو ہم اس کی کفالت اور نگہداشت سے بری ہوں گے۔ [1]

[1] کتاب الخراج، قاضی ابو یوسف فصل فی الکنائس والبیع والصلبان، ص: ۱۴۴۔

اس معاہدہ پر عمل درآمد خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ہوا اور اس وقت موجود صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے اعتراض نہ کیا، جو متفقہ فیصلہ ہونے کی دلیل ہے۔

بعینہٖ اسی قسم کا ایک معاہدہ خلیفۂ دوم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں تحریر کیا گیا، جس میں غیر مسلموں کو سماجی تحفظ، یعنی جان و مال کی حفاظت اور ناداری کی صورت میں مکمل تعاون کا یقین دلایا گیا، اس میں شک نہیں کہ خلفائے راشدین کا یہ عمل مسلمانوں کے لیے نمونہ ہے جسے قیامت تک آنے والے مسلمان، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی طرح اپنے سینہ سے لگائیں گے، یہ اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انتہائی بلیغ انداز میں فرمایا:

((فَإِنَّهُ مَنْ يَعِشْ مِنْكُمْ بَعْدِي فَسَيَرَى اخْتِلَافًا كَثِيرًا فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ مِنْ بَعْدِي عَضُّوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ)) [1]

"(سنو) تم میں سے جو کوئی زیادہ عرصے تک زندہ رہے گا وہ اپنے اردگرد بہت سارے جھگڑے اور طرح طرح کے اختلافات دیکھے گا، لیکن ایسے وقت اس کا کام بس یہ ہونا چاہیے کہ وہ میری سنت اور میرے راست باز خلفا کے اوصاف اور سیدھے طریقے کو مضبوطی سے تھام لے اور اس پر عمل کرے۔"

خلیفۂ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے بصرہ کے حاکم حضرت عدی بن ارطاۃ کو ایک خط لکھا اور تاکید فرمائی کہ اس میں درج کیے گئے تمام ضابطوں کی پوری پوری تعمیل کی جائے۔ جب یہ خط بصرہ پہنچا تو اس کی اہمیت کے پیش نظر حاکم وقت نے عوام کے سامنے اسے پڑھ کر سنایا، اس میں تحریر تھا:

[1] ابوداود، كتاب السنة، باب فی لزوم السنة، رقم: ٤٦٠٧؛ ترمذی، كتاب العلم، باب ما جاء فی الأخذ بالسنة وإجتناب البدعة، رقم: ٢٦٧٦؛ ابن ماجه، كتاب السنة، باب اتباع سنة الخلفاء الراشدين المهديين، رقم: ٤٢؛ سنن الدارمی، المقدمه باب اتباع السنة، رقم: ٩٥؛ مسند احمد: ٤/ ١٢٦، رقم: ١٦٦٩٢۔

''اپنی علمداری میں تلاش کرو، تمہیں کہیں ایسے ذمی نظر آئیں گے، جو کمزور اور اپاہج ہوں گے، تمہارا فرض ہے کہ بیت المال سے حسب ضرورت ان کا روزینہ مقرر کرو، اس لیے کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ امیر المومنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے ایک بوڑھے اندھے کو بھیک مانگتے دیکھا آپ نے اس کا کندھا پکڑ کر پوچھا، تو کس اہل کتاب سے ہے، اس نے کہا، میں یہودی ہوں، آپ نے پوچھا، پھر بھیک کیوں مانگ رہا ہے۔ اس نے کہا، مجھ سے جزیہ طلب کیا جارہا ہے اور مجھ میں ادائیگی کی سکت نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے گھر آئے اور اپنے یہاں سے کچھ عنایت کر کے بیت المال کے خزانچی کو بلا بھیجا اور حکم دیا کہ اس کی حالت دیکھو اور اس کے لیے کچھ مقرر کردو، اور اس سے جزیہ نہ لو، بخدا! یہ انصاف کی بات نہیں کہ ان لوگوں کی جوانی سے ہم فائدہ اٹھائیں اور بڑھاپے میں انہیں ٹھوکر کھانے کے لیے چھوڑ دیں۔ [1]

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے مذکورہ بیان کے آخری الفاظ قابل غور ہیں، جس طرح حکومتیں مالداروں سے محصول وصول کرتی ہیں، اسی طرح نادار ہو جانے پر سرکاری خزانے سے ان کی مدد کرنا حکومتوں کا فرض ہونا چاہیے۔ یہ نہیں کہ جب تک لوگوں کے پاس دولت تھی، ان سے خوب خوب وصول کیا اور جب وہ نادار اور اپاہج ہو گئے، ان کو نظر انداز کر دیا۔

جوابدہی کا تصور

بیت المال سے غریبوں کی مجوزہ امداد کی صورت میں ایسا وقت آسکتا ہے، جبکہ امداد کا کام ختم ہو جانے سے پہلے بیت المال کا خزانہ خالی ہو جائے اور دوسری طرف عام مسلمانوں کے دلوں سے ناداروں کے لیے ان کا ایثار و قربانی کا جذبہ بھی سرد پڑ جائے۔ ایسے نازک موقعہ پر اسلامی حکومت کی پالیسی یہ ہوگی کہ وہ مالداروں پر جبری امداد لاگو کرے گی اور ان سے زبردستی روپیہ وصول کرے گی۔ اس ایک مثال سے اسلامی حکومت کی عظمت

---

[1] كتاب الاموال، باب اجتباء الجزية والخراج وما يؤمر به من الرفق باهلها وينهى عنه من العنف عليهم فيها، ص: ٤٦ ٢۔

وقوت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اس اقدام کی معقول وجہ ہے، وہ یہ کہ حکومتوں کا کام محض افراد یا ان کی جائیداد کی حفاظت نہیں یا اس کا سب سے بڑا مقصد قیام امن یا صرف ظلم وجور کا انسداد نہیں، جس کے بعد لوگ آزاد ہیں اور آزادی کے نام پر جو چاہیں کریں اور اسی ضمن میں غریبوں کو حالات کے رحم وکرم پر چھوڑ دیں۔ جس کے بعد یا تو وہ دین سے مرتد ہو جائیں، یا غریبی اور افلاس کے عالم میں اس دنیا سے کوچ کر جائیں۔ جیسا کہ انفرادی اور آزاد معاشی پالیسی کے ایک نقیب اور ہمدرد ''آدم سمتھ'' کا یہ نظریہ ہے کہ حکومت کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ مالداروں کو زیادہ سے زیادہ آزادی اور خود مختاری دے اور ناداروں کو ان کے قریب تک نہ جانے دے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ سماج کے جملہ افراد ایک اقتصادی مشنری کے کل پرزے ہیں، وہ باہم مربوط صرف اس لیے ہوتے ہیں، تاکہ ملک کی پیداوار بڑھائیں اور معاش کی نئی نئی راہیں کھولیں، لیکن اسلام اس نظریے کی سخت مخالفت کرتا ہے۔ اس کا یہ عقیدہ ہے کہ تمام افراد کسی اقتصادی مشنری کی طرح نہیں، بلکہ ایک خاندان کی طرح ایک دوسرے سے باہم مربوط ہوتے ہیں، اسی طرح ان کا باہمی ربط پیداوار بڑھانے یا معاش کی نت نئی راہیں کھولنے کے لیے نہیں، بلکہ ان کا ربط، ایمان اور اسلام کے لازوال رشتہ کی بنا پر ہوتا ہے اور یہ اسی عقیدے کی برکت ہے کہ ان کا رنگ اور ان کی نسل مختلف ہوتی ہے، لیکن اس کے باوجود ان کا راستہ اور ان کی منزل ایک اور صرف ایک ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اس صفت سے متصف سماج کو ایک جسم اور ایک قالب سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی جس طرح ایک جسم کا عضو ایک دوسرے سے مرتبط ہوتا ہے ایک دوسرے کو سہارا دیتا ہے اور فائدہ پہنچاتا ہے، یہی حال مسلم معاشرے اور اسلامی سماج اور اس کے افراد کا ہوتا ہے۔

اسلام بتاتا ہے کہ امام جو حکومت کا نظم ونسق چلانے کے لیے مقرر ہوتا ہے۔ درحقیقت اس کی حیثیت جسم کے اندر ''سر'' کی سی ہوتی ہے، جو افراد کے اندر جملہ روابط اور

اشتراک کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ ورنہ اس کے بغیر معاشرہ ہر قسم کے برگ و بار سے خالی اور تہی ہو جاتا ہے۔ اب یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ امام کی حیثیت، شہنشاہیت کے محافظ دستے کی سی نہیں اور نہ اس کا کام محض اندرونی یا بیرونی حملوں سے لوگوں کی عام حفاظت کرنا ہے بلکہ دیکھا جائے تو اس کا کام اس سے بھی بڑا اور اہم ہے۔ دراصل اسلام میں امام کو وہی مقام حاصل ہوتا ہے جو خاندان کے اندر باپ کو حاصل ہوتا ہے۔ اسی لیے بخاری و مسلم کی اس روایت میں دونوں کا ذکر ایک ساتھ کیا گیا ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ فَالْإِمَامُ رَاعٍ وَهُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ وَالرَّجُلُ فِيْ أَهْلِ بَيْتِهِ رَاعٍ وَهُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ)) [1]

''تم میں سے ہر کوئی نگران ہے اور ہر کسی کو اپنے ماتحتوں کے بارے میں جواب دینا ہوگا۔ امام وقت بھی نگران ہے اور اپنی رعیت سے متعلق جوابدہی اسے کرنی ہوگی۔ اسی طرح گھروں میں باپ بھی نگران اور جوابدہ ہے اور گھر کے جملہ افراد کے بارے میں اس سے باز پرس ہوگی۔''

ہر کوئی جانتا ہے کہ باپ کا کام خاندان کی حفاظت نہیں ہوتا بلکہ اس کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کی پرورش اور تربیت کرے، ان کے ساتھ عدل و انصاف کا برتاؤ کرے اور دستور کے مطابق ان پر خرچ کرے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ آپ کہا کرتے تھے۔ انسان تو درکنار، عراق میں اگر کوئی خچر سے گر جائے تو مجھے ڈر ہے کہ قیامت کے دن خدا مجھ سے پوچھے گا کہ میں نے اس کے چلنے کے لیے راستے کیوں نہیں درست کئے تھے۔ [2]

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ ان کی بیوی حضرت فاطمہ کی زبانی

[1] بخاری، کتاب الجمعة، باب الجمعة فی القری والمدن، رقم: ۸۹۳؛ مسلم، کتاب الامارة، باب فضیلة الامیر العادل وعقوبة الجائر، رقم: ٤٧٢٤؛ ترمذی، کتاب الجهاد، باب ما جاء فی الامام، رقم: ١٧٠٥؛ مسند احمد: ٢/ ٥، رقم: ٤٤٨١۔

[2] طبقات ابن سعد، ذکر استخلاف عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، ج٣/ ٣٠٥۔

تاریخ میں موجود ہے، وہ کہتی ہیں، ایک بار میں اس کے پاس پہنچی، وہ نماز پڑھ کر چہرے پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے، میں نے پوچھا، کیوں کیا ہوا؟ جواب میں فرمایا، فاطمہ! بہت برا ہوا۔ تم دیکھتی ہو، رعایا کی ساری ذمہ داری میرے سر ہے۔ مجھے رہ رہ کر یہ خیال آتا ہے کہ ملک کے مختلف علاقوں میں راستوں اور سڑکوں پر غریب غربا پڑے ہوں گے، جو نان شبینہ کو ترستے ہوں گے، ایسے بیمار ہوں گے، جن کا کوئی پرسان حال نہ ہوگا، ایسے ننگے بدن ہوں گے، جن کے تن پر کپڑا نہ ہوگا، دل شکستہ یتیم اور وہ بیوائیں ہوں گی، جن کا ہمدرد اور غمخوار کوئی نہ ہوگا، عمر رسیدہ بوڑھے اور کثیر العیال افراد ہوں گے، جن کی پریشانی بیان سے باہر ہوگی...... مجھے یقین ہے کہ ان سب کے بارے میں قیامت کے دن خدا مجھ سے جواب طلب کرے گا۔ مزید براں حضور ﷺ کا بھی سامنا ہوگا۔ سچ پوچھو تو اس وقت کی اپنی بے بسی اور بیچارگی پر مجھے اس وقت رونا آتا ہے۔ [1]

خلیفہ منتخب ہونے کے بعد پہلی بار حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ اپنے گھر آئے، چہرے پر گہری فکر کے آثار نمایاں تھے، خادم نے عرض کیا، آپ فکر مند کیوں ہیں؟ آج تو خوشی کا دن ہے! جواب میں آپ نے فرمایا: ''تیرا برا ہو، آج تو غم کا دن ہے۔ تم جانتے ہو، اس امت کے سبھی افراد خواہ ان کا تعلق مشرق سے ہے یا مغرب سے، مجھ سے اپنا حق طلب کر رہے ہیں۔ یہ درست ہے کہ فرداً فرداً ان سے ہر ایک کی درخواست میرے سامنے نہ آئی، یا انہوں نے براہ راست مجھ سے اس کا مطالبہ نہیں کیا، لیکن بہر حال میرا یہ فرض ہوگا کہ میں ان کے حقوق ادا کروں۔'' [2]

اپنے وقت کا یہ بیدار مغز خلیفہ محض اس اندیشہ سے لرزتا تھا کہ ساری امت خصوصاً غربا و مساکین کی بابت ان سے باز پرس ہوگی۔ خواہ وہ کہیں کے ہوں۔

① بنا بریں اسلامی قلمرو میں یہ ضروری قرار دیا گیا کہ وہاں کے حکمران عدل و مساوات کو قائم کریں، خیر اور بھلائی کی دعوت دیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اپنا

---

[1] البداية والنهاية، فصل وقد كان منتظرًا يؤثر من الأخبار، ج٩ ص: ٢٠١۔

[2] البداية والنهاية، فصل وقد كان منتظراً فيما يؤثر من الأخبار، ج٩ ص: ١٩٨۔

شعار بنائیں، لیکن بلاشبہ انصاف پسندی، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یہ نہ ہوگا کہ غریب اور کمزور بھوکے مریں، یا کھانے، کپڑے اور مکان جیسی بنیادی ضروریات سے محروم رہیں، جبکہ سماج میں انہیں کے اردگرد ایسے لوگ بھی ہوں جن کے پاس زائد رقم اور فاضل سرمایہ بدستور موجود ہو۔

② اسلامی حکومتوں کا دوسرا فرض یہ بھی ہے کہ غریبی ہٹانے اور ناداروں کو معقول زندگی کے مواقع مہیا کرنے کے لیے مختلف وسائل و ذرائع پیدا کریں۔ یہاں ان ذرائع کی تعیین یا اس پر بحث و تمحیص یقیناً بے معنی ہوگی، اس لیے کہ زمانہ، ماحول اور مقام کے لحاظ سے ان ذرائع و وسائل کی شکلیں لامحالہ بدلتی رہیں گی، پھر درحقیقت امت کے باہوش اور جدت پسند طبقہ کے لیے یہ بھی ایک کشادہ میدان ہوگا، جہاں وہ اپنی فکر و تدبیر کی جولانی کا مظاہرہ بھی کریں گے اور اپنے بچھڑے ہوئے بھائیوں کے لیے روزگار کی نت نئی راہیں بھی پیدا کریں گے، ایک مثال کے ذریعہ اس کی وضاحت کی جاتی ہے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے غربا و مساکین کے لیے جو مختلف اسکیمیں جاری فرمائیں۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ آپ نے مدینہ کے قریب (ربذہ) نامی چراگاہ کو چاروں طرف سے گھیر کر محفوظ کر دیا تھا اور یہ اعلان جاری کیا تھا کہ اس زمین میں صرف غریب مسلمان اپنے مویشیوں کو چرائیں گے۔ اور زمین بھی مشترکہ طور پر بستی کے غریب مسلمانوں کی ملکیت متصور ہوگی۔

اس اسکیم کا مقصد یہ تھا کہ غریب طبقہ اس سے فائدہ اٹھائے۔ ان کے مویشیوں کی افزائش ہو اور حکومت کی مزید امداد کے بغیر ان کی گزر بسر ہوتی رہے۔

''ھنی'' جو سرکاری طور پر اس چراگاہ کی نگرانی کے لیے مقرر ہوئے تھے، ان کے نام حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے جو تحریر ارسال فرمائی، اس میں مذکورہ بالا مفاد آپ کے پیش نظر تھا، تحریر یہ ہے: [1]

''ھنی'' لوگوں سے مت الجھنا، مظلوم کی بددعاؤں سے بچنے کی ہمیشہ کوشش کرنا،

[1] الاموال، باب حمی الأرض ذات الکلاء والماء، ص: ۲۹۸۔

اس لیے کہ خدا کے دربار میں وہ فوراً مقبول ہو جاتی ہیں۔ اس کا خیال رکھنا کہ جن لوگوں کے پاس کم اونٹ اور بکریاں ہوں، وہی چراگاہ سے فائدہ اٹھائیں۔ بنا بریں (حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اور عبدالرحمٰن) بن عوف رضی اللہ عنہ کے اونٹوں کو گھسنے نہ دینا۔ اس لیے کہ ان کے مویشی برباد ہو بھی جائیں تو کیا غم؟ ان کے کھیت اور کھجوروں کے باغات ان کے لیے ہر طرح کافی ہیں البتہ ان بیچاروں کے مویشی مرنے لگیں گے تو یہ کہیں کے نہ رہیں گے، پھر اگر یہ میرے پاس فریاد لے کر آئیں گے تو میں انہیں کیونکر نظر انداز کروں گا۔ میری نظر میں بجائے سیم و زر کے، چارے اور گھاس سے ان کی امداد کرنا، زیادہ مناسب ہے۔ (الاموال لابی عبید ص ۲۹۹) اس تحریر سے خاص طور پر تین امور کا پتہ چلتا ہے:

① اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ محدود آمدنی والے، خصوصاً غریب طبقے پر اپنی توجہ مرکوز کرے۔ ان کے لیے کھانے، کمانے کے ذرائع فراہم کرے اور اس بات کی بالکل پروا نہ کرے کہ اس کے تجویز کردہ ذرائع سے مالداروں پر اثر پڑے گا، یا ان کے مفاد مجروح ہوں گے۔

② اسلامی حکومت کے زیر سایہ زندگی گزارنے والے تمام افراد کو جو ذریعۂ معاش یا روزگار سے محروم ہو گئے ہوں، یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ ذمہ دار حاکم کے سامنے فریاد کریں اور بیت المال سے اپنے اور اپنے بال بچوں کے حقوق طلب کریں، حکومت کا بھی فرض ہوگا کہ ان کی فریاد سنے اور ان کے لیے معقول بندوبست کرے۔

③ بیدار سیاسی بصیرت یہ ہے کہ روزگار کے نئے نئے ذرائع کی فکر کی جائے، ذہین محنتی لوگوں کو کام سے لگایا جائے، اور اس طرح کم سرمایہ رکھنے والوں کی آمدنی بڑھانے کی تدابیر کی جائیں، تاکہ یہ لوگ اپنے پیروں پر کھڑے ہوں اور حکومت یا کسی ادارے کے محتاج نہ بنے رہیں۔

باب ہفتم
دیگر امدادی ذرائع

پانچواں ذریعہ......دیگر امدادی ذرائع

اگر فاقہ اور افلاس کی وبا عام ہو اور زکوۃ کی پوری پوری رقم ادا کرنے کے بعد بھی لوگ فاقے سے نجات نہ پاسکیں، تو ایسی صورت میں ایک مسلمان پر زکوۃ کے علاوہ کچھ تقاضے اور مطالبات ہیں، جن کی ادائیگی اس پر لازم ہوتی ہے، دیکھا جائے تو غریبوں کی اعانت اور انسانوں، خصوصاً مسلمانوں کے اندر سے تنگدستی کے انسداد کے لیے، ان کے اندر بھی بڑی طاقت مخفی ہے۔ان حقوق میں سے چند یہ ہیں:

① پڑوسی کے حقوق

قرآن پاک نے متعدد موقعہ پر اس حق کو ادا کرنے کی تاکید کی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

﴿وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ﴾ (٤/ النسآء:٣٦)

''اور تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک مت ٹھہراؤ اور والدین کے ساتھ اچھا معاملہ کرو اور اہل قرابت کے ساتھ بھی اور پاس والے پڑوسی کے ساتھ بھی اور ہم مجلس کے ساتھ بھی۔''

ایک حدیث میں ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ جَارَهُ)) [1]

''اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لانے والے کو پڑوسی کی عزت کرنی

[1] بخاری، کتاب الأدب، باب من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فلا يؤذي جارهُ، رقم: ٦٠١٩؛ مسلم، کتاب الایمان، باب الحث علی اکرام الجار و الضيف، رقم: ١٧٣؛ ابو داود، کتاب الأدب، باب في حق الجوار، رقم: ٥١٥٤؛ دارمی، کتاب الأطعمه، باب في الضيافة، رقم: ٢٠٣٥؛ ابن ماجه، کتاب الأدب، باب حق الجوار، رقم: ٣٦٧٢۔

چاہیے۔"

((مَا زَالَ جِبْرِيْلُ يُوْصِيْنِيْ بِالْجَارِ حَتّٰى ظَنَنْتُ اَنَّهُ سَيُوَرِّثُهُ)) ❶

"حضرت جبرائیل علیہ السلام نے پڑوسی کے حقوق ادا کرنے کی مجھے اس قدر تاکید کی کہ مجھے خیال آیا کہ کہیں اسے وراثت میں حصہ نہ دینا پڑے۔"

مشہور حدیث میں ہے۔ جس میں آپ ﷺ نے فرمایا:

((لَيْسَ بِمُؤْمِنٍ مَنْ بَاتَ شَبْعَانَ وَجَارُهُ إِلٰى جَنْبِهٖ جَائِعٌ وَهُوَ يَعْلَمُ)) ❷

"وہ آدمی مومن نہیں جو رات میں شکم سیر ہو کر سو رہے اور اس کے قریب کا پڑوسی یونہی بھوکا رہے، حالانکہ اسے معلوم ہے۔"

آپ ﷺ نے فرمایا:

((اَيُّمَا اَهْلِ عَرْصَةٍ اَصْبَحَ فِيْهِمْ اِمْرُؤٌ جَائِعٌ فَقَدْ بَرِأَتْ مِنْهُمْ ذِمَّةُ اللّٰهِ)) ❸

"جس گھرانے کا ایک فرد بھی بھوکا سو رہے (اور گھر کے دوسرے افراد اس کی کوئی فکر نہ کریں) تو باری تعالیٰ بھی ان سے بری الذمہ ہو جاتا ہے۔"

آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

((وَلَا تُؤْذِهٖ بِقِتَارِ قِدْرِكَ اِلَّا اَنْ تَغْرِفَ لَهٗ مِنْهَا وَاِذَا اشْتَرَيْتَ فَاكِهَةً فَاَهْدِلَهٗ مِنْهَا فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَاَدْخِلْهَا سِرًّا وَلَا يَخْرُجُ بِهَا

---

❶ بخاری، کتاب الأدب، باب الوصاءة بالجار، رقم: ٦٠١٤؛ مسلم، کتاب البر والصلة، باب الوصية بالجار والاحسان اليه، رقم: ٦٦٨٥؛ ابوداود، کتاب الأدب، باب فی حق الجوار، رقم: ٥١٥٢؛ ابن ماجة، کتاب الأدب، باب حق الجوار، رقم: ٣٦٧٣؛ مسند احمد: ٢/ ٨٥ رقم: ٥٥٥٢۔ ❷ مستدرك حاکم، کتاب البر والصلة، ج٧ ص ٢٦٠٩، رقم: ٧٣٠٧۔ ❸ مستدرك حاکم، کتاب البیوع رقم ٢١٦٥، ج٣/ ٨٢١؛ مسند احمد: ٢/ ٣٣، رقم: ٤٨٦٥۔

وَلَدُكَ لِيَغِيظَ بِهَا وَلَدَهُ)) (مکارم اخلاق)

''اپنے گھر میں لذیذ پکوان پکا کر اس کی خوشبو سے پڑوسی کا دل نہ دکھاؤ، بلکہ کچھ اس کے یہاں بھی بھیج دو، حتیٰ کہ پھل خریدو، تب بھی اسے کچھ کھلا دو، ایسا نہ ہو کہ تمہارا بچہ ہاتھ میں پھل لے کر کھاتا ہوا پڑوس میں جائے اور وہاں بچے اس کا منہ تکتے رہیں۔''

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، میرے عزیز ترین رفیق صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس بات کی نصیحت کی تھی کہ اپنے یہاں کچھ پکاؤ تو شوربہ بڑھا لیا کرو۔ پھر کسی ضرورت مند پڑوسی کی تلاش میں نکل پڑو اور کچھ تھوڑا سا اسے دے آؤ۔ [1]

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری نہیں بلکہ سبھی جانتے ہیں کہ پڑوسی صرف وہ نہیں، جس کا مکان گھر سے متصل ہو، اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إِنَّ أَرْبَعِينَ دَارًا جَارٌ.)) (ابوداؤد)

''پڑوسی کا دائرہ چالیس گھر تک وسیع ہوتا ہے۔''

اس کی تشریح بعض نے یہ کی ہے کہ چاروں سمتوں میں چالیس گھر مراد ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ پورا محلّہ بمنزلہ پڑوس ہوا۔ رہا یہ سوال کہ ان میں مقدم اور مؤخر کون ہیں؟ تو ایک بار حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہی سوال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور پیش فرمایا، سامنے میرے دو پڑوسی ہیں ایک کا مکان دروازے کے عین سامنے ہے، دوسرا ذرا فاصلہ پر رہتا ہے اور ہماری حالت یہ ہے کہ کبھی ہمارے یہاں بس اتنا بچا کھچا ہوتا ہے، جو صرف ایک آدمی کے لیے بمشکل کافی ہوتا ہے، پس ان دونوں میں سے کون اس کا زیادہ حقدار ہے؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

[1] مسلم، کتاب البر والصلة، باب الوصية بالجار والاحسان اليه، رقم: ٦٦٨٩؛ دارمی، کتاب الأطعمة، باب فی اكثار الماء فی القدر، رقم: ٢٠٧٩؛ مسند احمد: ٥/ ١٤٩ رقم: ٢٠٨١٩؛ ترمذی، کتاب الأطعمة، باب ما جاء فی اكثار ماء المرقة، رقم: ١٨٣٣۔

((اَلْمُقْبِلُ عَلَیْکَ بِبَابِہٖ)) [1]

"جو دروازے کے سامنے ہے وہ زیادہ حقدار ہے۔"

درحقیقت اسلام کی تعلیم ہے کہ پورا محلّہ ایک یونٹ اور وحدت کی شکل میں آباد ہے۔ جہاں ایک کا غم سب کا غم اور ایک کی خوشی سب کی خوشی ہو، جہاں بھوکے شکم سیر ہو سکیں اور کسی کے بدن پر چیتھڑے نہ جھولتے رہیں، یہ اس لیے کہ اگر ایسا نہ ہوا تو خدا اور رسول اس کے ذمہ سے بری ہوں گے اور ایسا فرد خود کو اسلامی برادری میں شامل کہلانے کا حقدار بھی نہ ہوگا۔

اسلامی تعلیمات کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ مسلم اور غیر مسلم میں امتیاز کو سختی سے روکتا ہے اور ان کے ساتھ یکساں سلوک کا حکم دیتا ہے۔ چنانچہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں، میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی خدمت میں حاضر تھا۔ ان کا غلام بکری ذبح کر کے اسے چھیل رہا تھا، حضرت عبداللہ نے اس سے فرمایا، دیکھو بکری چھیل کر فرصت پاؤ تو سب سے پہلے پڑوس کے یہودی کے گھر گوشت دے آنا، تھوڑی دیر کے بعد آپ نے پھر یہی فرمایا، غلام نے اس اصرار کی وجہ پوچھی تو جواب میں آپ نے فرمایا:

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں پڑوسی کا حق ادا کرنے کی اس قدر تاکید فرماتے تھے کہ ہم سمجھتے تھے کہ اسے ترکہ سے حصہ بھی ملے گا۔" [2]

② قربانی

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مالدار صاحب نصاب پر واجب ہے اس لیے کہ حدیث میں ہے:

((مَنْ کَانَ لَهُ سَعَةٌ وَلَمْ یُضَحِّ فَلَا یَقْرَبَنَّ مُصَلَّانَا)) [3]

---

[1] بخاری، کتاب الهبة، باب بمن یبدأ بالهدية، رقم: ٢٥٩٥؛ بخاری، کتاب الشفعة، باب أی الجوار أقرب، رقم: ٢٢٥٩، بمعناه؛ بخاری، کتاب الأدب، باب حق الجوار فی قرب الأبواب، رقم: ٦٠٢٠؛ ابوداود، کتاب الأدب، باب فی حق الجوار، رقم: ٥١٥٥۔

[2] مسلم، کتاب البر والصلة، باب الوصية بالجار والاحسان اليه، رقم: ٦٦٨٧؛ ترمذی، کتاب البر والصلة، باب ما جاء فی حق الجوار، رقم: ١٩٤٢؛ ابوداود، کتاب الأدب، باب فی حق الجوار، رقم: ٥١٥٢؛ ابن ماجه، کتاب الأدب، باب حق الجوار، رقم: ٣٦٧٣۔ [3] ابن ماجه، کتاب الأضاحی، باب الأضاحی واجبة هی ام لا، رقم: ٣١٢٣؛ مسند احمد: ٢/ ٣٢١، رقم: ٨٠٧٤۔

”جس نے وسعت رکھتے ہوئے قربانی نہ کی، وہ ہماری عیدگاہ کے قریب نہ آئے۔“

③ قسم کا کفارہ

قرآن پاک میں ہے:

﴿ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ﴾ (۵/ المائدۃ:۸۹)

”(قسم کا) کفارہ یہ ہے کہ قسم کھا کر توڑنے والا دس فقیروں کو اوسط درجے کا کھانا کھلائے جو وہ کھاتا تھا، یا وہ کپڑا پہنائے، جو خود پہنتا تھا یا پھر ایک غلام آزاد کرے۔“

④ ظہار کا کفارہ

جس شخص نے اپنی بیوی سے کہا، تو میرے حق میں ایسی ہے جیسی میری ماں یا بہن کی پشت، تو اس صورت میں اس کی بیوی اس پر حرام ہو جائے گی، جب تک یہ شخص اپنی قسم کا کفارہ نہ دے اور اس قسم کا کفارہ یہ ہے کہ یا تو ایک غلام آزاد کرے یا مسلسل دو ماہ کے روزے رکھے، یہ بھی نہ ہو تو ساٹھ فقیروں کو کھانا کھلائے۔

⑤ رمضان کے دن میں جماع کا کفارہ

یہ کفارہ ظہار کی طرح ہے اور از روئے حدیث واجب ہے۔

⑥ بڑھاپے یا بیماری کے سبب روزہ نہ رکھنے کا فدیہ

جو لوگ رمضان کے روزے نہ رکھ سکیں، وہ ہر روزے کے بدلے کسی غریب کو کھانا کھلائیں:

﴿ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۴)

''اور جولوگ روزے کی طاقت رکھتے ہوں، ان کے ذمہ فدیہ ہے کہ وہ ایک غریب کا کھانا ہے۔''

حاملہ اور دودھ پلانے والی کو بچہ کے بارے میں خطرہ (یطیقونہ: بہ تکلف طاقت رکھنا) لاحق ہو تو اس کے لیے بھی یہی حکم ہے، جیسا کہ فقہا نے کہا۔

⑦ ہدی

گائے بکری یا اونٹ جنہیں حج یا عمرہ کرنے والے خانۂ کعبہ کے پاس اس لیے روانہ کریں کہ حالت احرام میں سرزد قصور کی تلافی ہو...... یا تمتع یا قران کا شکرانہ ادا ہو۔ ارشاد ہے:

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَأَنْتُمْ حُرُمٌ ۚ وَمَنْ قَتَلَهُ مِنْكُمْ مُتَعَمِّدًا فَجَزَاءٌ مِثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهِ ذَوَا عَدْلٍ مِنْكُمْ هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ أَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسَاكِينَ ﴾ (٥/ المآئدة:٩٥)

''اے ایمان والو! وحشی شکار کو قتل مت کرو، جب تک کہ تم حالت احرام میں ہو اور جو شخص تم میں سے اس کا جان بوجھ کر قتل کرے گا، تو اس پر بدلہ واجب ہوگا، جو مساوی ہوگا، اس جانور کے جس کو قتل کیا ہے، جس کا فیصلہ تم میں سے دو شخص کر دیں، خاص چوپایوں میں سے، بشرطیکہ نیاز کے طور کعبہ تک پہنچائی جائے اور خواہ کفارہ مساکین کو دے دیا جائے۔''

﴿ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ ﴾ (٢/ البقرة:١٩٦)

''تو جس شخص نے عمرہ سے اس کو حج کے ساتھ ملا کر فائدہ اٹھایا ہو تو جو قربانی میسر ہو۔''

بہت ممکن ہے کہ ہدی کا طریقہ شارع نے بھوک کے مسئلے پر قابو پانے اور غریبوں کو گوشت کی نعمت سے بہرہ ور کرنے کے لیے اختیار کیا ہو، اس لیے کہ یہ بھی ممکن تھا کہ اس موقعہ پر غلام آزاد کرنے کے لیے کہا جاتا یا روزہ رکھنے کا حکم ہوتا، یا اس کی قیمت یا اس سے زیادہ خیرات کرنے کے لیے کہا جاتا۔ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ ﴾ (۲۲/ الحج:۲۸)

''تو ان جانوروں میں سے تم بھی کھایا کرو، مصیبت زدہ کو بھی کھلایا کرو۔''

نیز فرمایا:

﴿ فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ۚ كَذَٰلِكَ سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴾ (۲۲/ الحج:۳٦)

''تو تم خود بھی کھاؤ اور بے سوال اور سوالی کو بھی کھانے دو، ہم نے ان جانوروں کو اس طرح تمہارے زیر حکم کر دیا، تاکہ تم شکر کرو۔''

⑧ کٹائی سے حصہ

قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَهُوَ الَّذِي أَنشَأَ جَنَّاتٍ مَّعْرُوشَاتٍ وَغَيْرَ مَعْرُوشَاتٍ وَالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا أُكُلُهُ وَالزَّيْتُونَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۚ كُلُوا مِن ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ ﴾

(٦/ الانعام:۱٤۱)

''خدا وہی ہے جس نے ایسے باغات بنائے جو ٹٹیوں پر چڑھائے جاتے ہیں اور (بعض ایسے جو) نہیں چڑھائے جاتے، اسی طرح کھجور، انار، زیتون اور بہت سی فصلیں ایک جیسی اور مختلف نظر آنے والی، جب یہ پھل دیں، تو تم ان کے پھلوں کو کھاؤ اور کٹائی کے اس دن کا حق غریبوں تک پہنچاؤ۔''

صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت کا قول ہے کہ یہ ادائیگی، زکوٰۃ کے علاوہ ہونی چاہیے، اس حق کے مستحق خصوصاً وہ لوگ ہیں، جو کھیت اور کھجوروں کے باغات کے مالک نہیں، علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی مذمت کی ہے جو پھل توڑ لیتے ہیں اور کسی کو کچھ نہیں دیتے، سورۂ ن میں باغ والوں کا قصہ اسی کا ثبوت ہے۔ [1]

---

[1] تفسیر ابن کثیر، ج ۲ ص: ۱۲۳؛ تفسیر سورۃ الانعام، ۱٤۲۔

⑨ غریبوں مسکینوں کی پرورش کا حق

یہ ایک اہم اسلامی فریضہ ہے، جو رب کا نائب اور اس کا خلیفہ ہونے کی حیثیت سے ہم پر لازم ہے، ساری مخلوقات میں سب سے اشرف ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ ہمارا احساس ایسا بیدار ہو کہ ضرورت مند کی ضرورت ہمارے دل کی ٹیس اور چبھن بن جائے۔ ہم خلیفۃ اللہ ہیں، اس لیے خدا کی طرف سے غریبوں کی حاجت روائی کے ذمہ دار ہیں اور اگر یہ حاجت روائی زکوٰۃ کی مد سے ممکن ہو تو اس سے بہتر بھلا کیا ہوگا؟ لیکن اگر زکوٰۃ کی آمدنی محدود اور ناکافی ہو تو اس صورت میں لازم ہوگا کہ زکوٰۃ کے علاوہ صدقات و خیرات غریبوں پر خرچ کیا جائے اور ان کی بنیادی ضرورتوں کی تکمیل کی جائے۔

ترمذی میں حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِنَّ فِی الْمَالِ لَحَقًّا سِوَی الزَّکٰوۃِ ثُمَّ تَلَا ھٰذِہِ الْاٰیَۃَ الَّتِیْ فِی الْبَقَرَۃِ ﴿لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ﴾)) [1]

''مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ بقرہ کی یہ آیت پڑھی۔ سارا کمال اسی میں نہیں کہ تم اپنا منہ......''

آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرابتداروں، یتیموں اور ناداروں کی کفالت بلند پایہ نیکی ہے، پھر اس کے آگے آیت میں نماز کی پابندی اور زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یتیموں وغیرہ کی کفالت اور زکوٰۃ کی ادائیگی دو الگ الگ چیزیں ہیں اور دونوں پر عمل کرنا اشد ضروری ہے۔

حسن معاشرت

اسلام میں سماج کی کفالت کے ثبوت کے لیے کسی آیت یا حدیث سے استدلال

[1] ترمذی، کتاب الزکاۃ، باب ما جاء انّ فی المال حقًّا سوی الزکاۃ، رقم: ٦٥٩؛ دارمی، کتاب الزکاۃ، باب ما یجب فی المال سوی الزکاۃ، رقم: ١٦٣٧۔

کی چنداں حاجت نہیں، اس لیے کہ اس کا ثبوت روز روشن کی طرح واضح اور صاف ہے۔ چنانچہ قرآن پاک کی مکی مدنی آیات اور صحیح احادیث کی بیشتر روایتیں کچھ اس طرح پر پڑھنے والے کے سامنے آتی ہیں، جن سے از خود اسلامی معاشرے کے اندر باہمی اشتراک اور تعاون اور سماج کی کفالت کا سارا نظام منظر عام پر آ جاتا ہے۔ سماجی کفالت کا حقیقی تعارف اس حدیث سے ہوتا ہے جس میں اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((اَلْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ کَالْبُنْیَانِ یَشُدُّ بَعْضُهٗ بَعْضًا)) [1]

''ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے ساتھ ایک مضبوط عمارت کے اجزا کی طرح رہنا چاہیے جو ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں اور ان کے جڑنے سے ہی پوری عمارت کھڑی ہوتی ہے۔''

دوسری حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

((مَثَلُ الْمُؤْمِنِیْنَ فِیْ تَوَادِّهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ وَتَرَاحُمِهِمْ کَمَثَلِ الْجَسَدِ الْوَاحِدِ إِذَا اشْتَکٰی مِنْهُ عُضْوٌ تَدَاعٰی لَهٗ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهَرِ وَالْحُمّٰی)) [2]

''مسلمانوں میں باہمی ہمدردی، محبت اور تعلق اس قسم کا ہونا چاہیے، جیسا کہ خود جسمانی اعضا کو ایک دوسرے سے ہوتا ہے۔ چنانچہ جب بھی کسی عضو میں تکلیف ہوتی ہے باقی ماندہ سارے ہی اعضا بخار کی تپش اور بے خوابی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔''

آپ ﷺ نے فرمایا:

---

[1] بخاری، کتاب المظالم، باب فی نصر المظلوم، رقم: ٢٤٤٦؛ مسلم، کتاب البر والصلة والأدب، باب تراحم المؤمنین وتعاطفهم وتعاضدهم، رقم: ٦٥٨٥؛ ترمذی، کتاب البر والصلة، باب فی شفقة المسلم علی المسلم، رقم: ١٩٢٨؛ نسائی، کتاب الزکاة، باب اجر الخازن إذا تصدق بإذن مولاهٗ، رقم: ٢٥٦١؛ مسند احمد: ٤/ ٤٠٥، رقم: ١٩١٢٨۔

[2] بخاری، کتاب الأدب، باب رحمة الناس والبهائم، رقم: ٦٠١١؛ مسلم، کتاب البر والصلة والأدب، باب تراحم المؤمنین وتعاطفهم وتعاضدهم، رقم: ٦٥٨٦؛ مسند احمد: ٤/ ٢٧٠ رقم: ١٧٩١٣۔

((اَلْمُسْلِمُ أَخُوا لْمُسْلِمِ لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يُسْلِمُهُ)) [1]

''مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں وہ نہ ایک دوسرے کو ستاتے ہیں نہ ہی ذلیل کرتے ہیں۔''

ذلیل نہ کرنے کا مفہوم یہی ہے کہ مسلمان دوسرے مسلمان کو مصیبت میں دربدر کی ٹھوکریں کھانے کے لیے تنہا نہیں چھوڑتا، بلکہ اس کی دست گیری کرتا ہے، نیز فرمایا: ''جس گھر کا ایک فرد بھی بھوکا سو رہا ہو، اس گھر کے لوگ اپنے ذمہ دار آپ ہوں گے، اللہ تعالیٰ پر ان کی کوئی ذمہ داری نہیں۔'' (حاکم)

سورۂ مدثر جو ابتدائی زمانہ میں نازل ہوئی، اس میں قرآن پاک آخرت کا ایک منظر دکھاتا ہے۔ جہاں داہنی سمت میں مسلمان جنت کے باغوں میں آرام سے بیٹھے ہوں گے اور کافروں اور جھٹلانے والوں کی حالتِ زاران کا موضوع بحث ہوگی۔ پس منظر یہ ہوگا کہ ان دونوں گروہ کے درمیان آگ کا پردہ حائل ہوگا، پھر یک بیک پردہ اٹھے گا اور کافر نڈھال ہو کر اپنی بپتا سنائیں گے:

''ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے میں ہے، مگر داہنے طرف والے (نیک لوگ) کہ وہ بہشت کے باغوں میں (ہوں گے، اور) گنا ہگاروں سے پوچھتے ہوں گے کہ تم دوزخ میں کیوں پڑے، وہ کہیں گے کہ ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہ تھے، اور نہ مسکینوں کو کھانا کھلاتے تھے۔'' (۷۴/ المدثر: ۳۸ تا ۴۰)

کھلانے اور پلانے کی طرح اور دوسری ضرورتیں پوری کرنے سے وہ گریز کرتے تھے۔

سورۂ قلم میں اللہ تعالیٰ نے باغ والوں کا قصہ سنایا، انہوں نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ راتوں رات سارے پھل توڑ لیں گے، تاکہ صبح دم غریب غربا ہمارے باغ میں آئیں تو

---

[1] بخاری، كتاب المظالم، باب لا يظلم المسلم المسلم ولا يسلمه، رقم: ۲۴۴۲؛ ترمذی، كتاب الحدود، باب ما جاء فی الستر علی المسلم، رقم: ۱۴۲۶؛ مسند احمد ۶۸/۲، رقم: ۵۳۳۴؛ ابوداود، كتاب الأدب، باب المؤاخاة، رقم: ۴۸۹۳؛ مسلم، كتاب البر والصلة والأدب، باب تحريم ظلم المسلم وخذله وإحتقاره، رقم: ۶۵۴۱۔

انہیں خالی ہاتھ واپس جانا پڑے۔ خدا نے ان کے متعلق فرمایا:

﴿فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ نَآئِمُوْنَ ۝ فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ ۝ فَتَنَادَوْا مُصْبِحِيْنَ ۝ اَنِ اغْدُوْا عَلٰى حَرْثِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰرِمِيْنَ ۝ فَانْطَلَقُوْا وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ ۝ اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مِّسْكِيْنٌ ۝ وَّغَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِيْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْٓا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ۝ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ۝ قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ ۝ قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝ فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ ۝ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ ۝ عَسٰى رَبُّنَآ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَآ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ ۝ كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ؕ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝﴾

(٦٨/ القلم:١٩ تا ٣٣)

''وہ ابھی سو رہے تھے کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے راتوں رات اس کے باغ پر ایک آفت آ پڑی اور ان کا باغ ایسا ہو گیا جیسے کٹی ہوئی کھیتی۔ جب صبح ہوئی تو وہ لوگ ایک دوسرے کو کوسنے لگے کہ اگر تمہیں توڑنا ہے تو اس باغ میں سویرے ہی جا پہنچو، تب وہ چل پڑے اور آپس میں چپکے چپکے کہتے جاتے تھے کہ آج تمہارے پاس کوئی فقیر نہ آنے پائے اور یوں بڑی تیزی سے چل کر سویرے ہی جا پہنچے، گویا باغ کی سب چیز ان کے بس میں تھی، لیکن جب باغ کو دیکھا تو ویران، کہنے لگے ہم راستہ بھول گئے ہیں، نہیں! بلکہ ہم واقعی بدقسمت ہیں، پھر ایک جو، ان میں فرزانہ تھا، بولا، کیا میں نے تم سے نہ کہا تھا کہ تم تسبیح کیوں نہیں پڑھتے۔ تب وہ کہنے لگے ہمارا پروردگار پاک ہے، بے شک ہم ہی قصوروار تھے، پھر لگے ایک دوسرے کو ملامت کرنے، پھر کہنے لگے کہ بے شک ہم حد سے نکلنے والے

تھے، شاید ہمارا پروردگار ہم کو اس سے اچھا باغ بدلے میں دے دے۔ ہم اپنے رب کی طرف رجوع کرتے ہیں، اس طرح عذاب ہوتا ہے اور آخرت کا عذاب اس سے بھی بڑھ کر ہے، کاش یہ جان لیتے!''

قرآن کریم نے مسکینوں کو کھانا کھلانے اور ان کے ساتھ رعایت کرنے کی تاکید ہی نہیں کی، نہ ہی ان کے ساتھ بدسلوکی پر محض عذاب سے ڈرایا، دھمکایا، بلکہ ہر مسلمان صاحب ایمان کو اس کا پابند کیا کہ اس کو غریبوں کا حق سمجھے اور خود بھی اس حق کو انجام دے اور دوسروں کو بھی اس کی طرف متوجہ کرے، اور انہیں بتائے کہ ان کے حقوق ادا نہ کرنا خدا کی بڑی ناشکری اور دار آخرت میں جہنم کے عذاب کا باعث ہوگی اور سب سے بڑا عذاب یہ کہ خدا اس سے ناراض ہوگا۔

بائیں ہاتھ میں نامۂ اعمال پانے والوں کے بارے میں ارشاد ہے:

﴿ وَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِشِمَالِهِ فَيَقُولُ يَا لَيْتَنِي لَمْ أُوتَ كِتَابِيَهْ ۝ وَلَمْ أَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ ۝ يَا لَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ ۝ مَا أَغْنَىٰ عَنِّي مَالِيَهْ ۝ هَلَكَ عَنِّي سُلْطَانِيَهْ ۝ ﴾ (۶۹/ الحاقة: ۲۵ تا ۲۹)

''اور جس کا نامۂ اعمال اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا تو وہ کہے گا کہ کیا اچھا ہوتا، کہ مجھ کو میرا نامۂ اعمال ہی نہ ملتا اور مجھ کو بھی خبر نہ ہوتی کہ میرا حساب کیا ہے۔ کیا اچھا ہوتا کہ موت ہی خاتمہ کر چکتی، (افسوس) میرا مال میرے کچھ کام نہ آیا، میرا جاہ بھی مجھ سے گیا گزرا۔''

پھر باری تعالیٰ حق وصداقت اور انصاف پر مبنی فیصلہ کرتے ہوئے فرمائے گا:

﴿ خُذُوهُ فَغُلُّوهُ ۝ ثُمَّ الْجَحِيمَ صَلُّوهُ ۝ ثُمَّ فِي سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُونَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوهُ ۝ ﴾ (۶۹/ الحاقة: ۳۰، ۳۱، ۳۲)

''اس شخص کو پکڑو اور اس کو طوق پہنا دو پھر دوزخ میں اس کو داخل کرو، پھر ایک ایسی زنجیر میں جس کی پیمائش ستر گز ہے اس کو جکڑ دو۔''

اس وحشت اثر فیصلہ کے پس منظر میں وہ اسباب کیا ہیں، جس کی وجہ سے اتنا سخت حکم صادر ہوا، اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ إِنَّهُ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ الْعَظِيمِ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ۝ ﴾ (٦٩/ الحاقة: ٣٣، ٣٤)

''یہ شخص خدائے بزرگ پر ایمان نہ رکھتا تھا اور (خود تو کسی کو کیا دیتا) اوروں کو بھی غریب آدمی کے کھلانے کی ترغیب نہ دیتا تھا۔''

یعنی غریبوں کی حاجت برآری کے لیے نہ خود پیش قدمی کرتا تھا، نہ اپنے گردو پیش میں کسی اور کو اس کے لیے آمادہ کرتا تھا.......... سورۃ الحاقۃ میں نامۂ اعمال بائیں ہاتھ میں پانے والے جن جہنمیوں کا ذکر ہوا، ان کے عذاب کی وجہ یہی بتائی گئی کہ انہوں نے دنیا میں رہ کر نہ خدا کے حقوق جانے، اور نہ بندوں کے حقوق پہچانے، غریبوں اور مسکینوں کی خود کیا کفالت کرتے، دوسروں کو بھی اس کی ترغیب نہ دیتے تھے، ان دل ہلا دینے والی آیتوں کو سن کر حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ نے ام درداء رضی اللہ عنہا سے کہا تھا: ''سنو ام درداء! جہنم میں نہ جانے کتنے دنوں سے کچھ آہنی زنجیریں آگ میں مسلسل تپائی جارہی ہیں۔ محض اس لیے کہ لوگوں کی گردنیں ان کے ذریعے جکڑی جائیں۔ خدا کا شکر ہے کہ خدا پر ایمان لا کر ہم ایک حد تک اس سے نجات پا گئے، لیکن یاد رکھو ہم پورے طور پر اس سے اسی وقت محفوظ ہوں گے، جبکہ ناداروں اور ضرورت مندوں کی ضرورتیں بھی ہم پوری کریں۔'' (الاموال ص ۳۲۲)

اس میں شک نہیں کہ قرآن حکیم سے پہلے ایسی کوئی کتاب نازل نہیں ہوئی جو غریبوں کے ساتھ غفلت کو جہنم کے دائمی عذاب کا سبب قرار دیتی ہے، سورۂ ماعون میں بتایا گیا کہ یتیموں پر غصہ کرنا اور غریبوں کو کھانا نہ کھلانا دین کو جھٹلانے والوں کی علامت ہے:

﴿ أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ ۝ فَذَٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ۝ ﴾ (١٠٧/ الماعون: ١ تا ٣)

''کیا آپ نے اس شخص کو نہیں دیکھا جو روز جزا کو جھٹلاتا ہے۔ سو اگر آپ

اس شخص کا حال سننا چاہیں تو سنئے کہ وہ شخص ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور محتاجوں کو کھلانے کی دوسروں کو بھی ترغیب نہیں دیتا۔"

سورۂ فجر میں غریبوں کی حق تلفی کرنے والوں سے بڑے تیکھے انداز میں کہا گیا:

﴿ كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ ۝ وَلَا تَحٰٓضُّونَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝ ﴾

(۸۹/ الفجر:۱۷، ۱۸)

"تم نہ یتیموں کی عزت کرتے ہو، نہ ہی محتاجوں کو کھلانے کی آپس میں تاکید کرتے ہو۔"

ان آیات کے ذکر کیے جانے کا حاصل یہ ہے کہ جب جاہلی سماج، بائیں بازو والے اور دین کو جھٹلانے والے، غریبوں کو بری طرح نظر انداز کر دیتے تھے تو ایمان لانے والوں اور دینداروں کا فرض لامحالہ یہ ہونا چاہیے کہ اپنے ان بچھڑے ہوئے بھائی بندوں کے ساتھ ہمدردی سے پیش آئیں اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیں، قرآن حکیم کی آیات اسی بات کا حکم دیتی ہیں اور بقول شیخ محمد عبدہ مصری، سماجی اور فلاحی اداروں کا طریقہ کار یہی ہونا چاہیے۔

علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق

اسلاف میں علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اس معنی میں ممتاز ہے کہ آپ نے اس نظریہ کی مکمل حمایت کی اور کتاب وسنت اور صحابہ وتابعین کے فتاویٰ سے اس کی تائید و توثیق کی، لیکن یہ عمل قابل ذکر ہے کہ علامہ موصوف کا یہ طرز تحقیق اسی ایک مسئلے کے ساتھ خاص نہیں۔ آپ کی ہمیشہ کی یہ عادت تھی کہ پیش آمدہ کسی مسئلے کا فوری حل عقل وقیاس سے نہیں کرتے تھے، بلکہ براہ راست کتاب وسنت کی صراحتوں میں اس کو تلاش کرتے تھے۔ چنانچہ مذکورہ بالا مسئلے کے حل کے لیے بطور خاص آپ نے ایک ایسا لائحہ عمل مرتب کیا، جس کی مدد سے ہر بستی کے مخلص صاحب حیثیت افراد ادنیٰ توجہ کریں تو بڑی آسانی سے زکوٰۃ کے علاوہ اپنی دیگر رقوم سے منظم پیمانے پر اپنی اپنی بستی کے مسلمانوں کی اس طرح اعانت

کریں جس سے ان کی بنیادی اور روزمرہ کی ضرورتیں پوری ہوں اور غربت وافلاس میں گرفتار آبادی ایک خوبصورت مثالی بستی میں تبدیل ہو جائے۔

آپ کا پروگرام یہ تھا:

① عزت اور وقار کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے مناسب غذا کا انتظام۔

② وقت اور موسم کے لحاظ سے موزوں لباس۔

③ معقول رہائشی مکان، جس میں سردی، گرمی سے حفاظت اور پردے گوشے کا انتظام ہو۔

بعض اہل علم کا خیال ہے کہ مالداروں پر زکوٰۃ کے علاوہ کوئی اور چیز فرض نہیں۔ علامہ ابن حزم بڑی شدت سے اس کی تردید کرتے ہیں اور اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں۔ جس کا خلاصہ یہ ہے:

زکوٰۃ کی مناسب جمع وتقسیم کے باوجود اگر بستی والوں کی ضرورت باقی رہے تو دولت مند از خود یا حاکم بالجبر، مالداروں سے مزید اس قدر امداد طلب کر سکتا ہے جس سے غریبوں کی اہم اور بنیادی ضرورتوں جیسے کھانے، پہننے اور رہنے سہنے کا معقول انتظام ہو۔ [1]

تائید ربانی

☆...... اور رشتہ داروں اور محتاجوں اور مسافروں کو ان کا حق ادا کرو۔ (۱۷/ الاسرآء:۲۶)

☆...... اور ماں باپ اور قرابت والوں اور یتیموں اور محتاجوں اور قرابت والے پڑوسیوں اور اجنبی پڑوسیوں اور پاس بیٹھنے والے دوستوں اور مسافروں اور جو (باندی، غلام) تمہارے قبضے میں ہوں۔ (۴/ النسآء:۳۶)

معلوم ہوا کہ غریبوں اور اجنبی مسافروں کی طرح غریب رشتہ داروں کا بھی حق ہے اور ماں باپ، دور ونزدیک کے قرابت دار مسکین، پڑوسی اور ماتحت سب اس حق میں

[1] المحلیٰ لا بن حزم، مسئله فرض علی الأغنیاء من اهل کل بلدان ان یقوموا بفقرائهم ویجبرهم السلطان علی ذالك ان لم تقم الزکاة بهم وبرهان ذالك، رقم المسئلة ۷۲۵ ج ۶، ص: ۱۵۶۔

برابر کے شریک ہیں۔ مزید برآں آیت میں وارد احسان کا لفظ اپنے اندر ہمہ گیر معنی رکھتا ہے، جس سے ہمارے مسلک کی تائید ہوتی ہے، اس لیے کہ احسان کے برخلاف جو عمل کرے گا اسے بدسلوکی اور حد درجہ کی برائی سے تعبیر کیا جائے گا۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ۝ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ۝ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ ۝﴾ (۷۴/ المدثر: ۴۲، ۴۳، ۴۴)

''تم کو دوزخ میں کس بات نے داخل کیا، وہ کہیں گے ہم نہ تو نماز پڑھا کرتے تھے اور نہ غریب کو (جس کا حق واجب تھا) کھانا کھلایا کرتے تھے۔''

اس آیت میں باری تعالیٰ نے نماز کی ادائیگی اور غربا پروری کو ایک درجہ میں ذکر کیا ہے۔

ارشاد نبوی ﷺ

ایک مشہور روایت میں آپ ﷺ نے فرمایا:

((لَا يَرْحَمُ اللّٰهُ مَنْ لَا يَرْحَمُ النَّاسَ)) [1]

''جس نے بندگانِ خدا پر رحم نہ کیا، خدا اس پر بھی رحم نہیں کرے گا۔''

اگر کسی کے پاس ضرورت سے زائد چیز موجود ہو اور کوئی سخت حاجت منداس کے پاس آئے اور یہ اس کی امداد نہ کرے تو اس سے بڑھ کر بے رحمی اور کیا ہوگی۔ عبدالرحمن ابن ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ صفہ والے حضور ﷺ کے حد درجہ نادار صحابی تھے ان کے متعلق آپ عام صحابہ سے کہا کرتے تھے تم میں سے جس کسی کے پاس چار آدمیوں کی

---

[1] بخاری، کتاب التوحید، باب قول الله تعالیٰ ﴿قل ادعوا الله أو ادعوا الرحمن﴾ الآية، رقم: ۷۳۷۶؛ مسلم، کتاب الفضائل، باب رحمته الصبيان والعيال، رقم: ۶۰۳۰؛ ترمذی، کتاب البر والصلة، باب ما جاء في رحمة الناس، رقم: ۱۹۲۲؛ مسند احمد: ۳/ ۴۰، رقم: ۱۰۹۶۹۔

ضرورت بھر کھانا ہو وہ پانچ یا چھ کو لے جائے۔ [1]

اس روایت سے بھی مذکورہ بالا قول کی تائید ہوتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اَلْمُسْلِمُ اَخُو الْمُسْلِمِ لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يُسْلِمُهُ)) [2]

''مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرتا ہے، نہ اسے بے سہارا چھوڑتا ہے۔''

امام ابو محمد نے کہا کسی مسلمان بھائی کو بھوک پیاس میں نڈھال اور ننگے بدن چھوڑ دینا اس پر ظلم و زیادتی کرنا ہے، جبکہ اس کی ضرورت پوری کرنے پر قدرت رکھتا ہو۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ كَانَ مَعَهُ فَضْلُ ظَهْرٍ فَلْيَعُدْ بِهِ عَلَى مَنْ لَّاظَهْرَ لَهُ وَمَنْ كَانَ لَهُ فَضْلٌ مِنْ زَادٍ فَلْيَعُدْ بِهِ عَلَى مَنْ لَّا زَادَ لَهُ)) قَالَ فَذَكَرَ مِنْ أَصْنَافِ الْمَالِ مَا ذَكَرَ حَتَّىٰ رَأَيْنَا أَنَّهُ لَا حَقَّ لِأَحَدٍ مِنَّا فِيْ فَضْلٍ. [3]

''جس کے پاس دو پہر کا کھانا بچ رہا، وہ کسی ایسے شخص کو دے دے جس کے پاس کھانا نہ ہو، جس کے پاس توشہ بچ رہا وہ کسی ایسے کو دے دے جس کے پاس توشہ نہ رہے، راوی کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح قسم قسم کے احوال کا ذکر فرمایا اور یہی فرمایا، یہاں تک کہ ہم نے سمجھ لیا کہ ضرورت سے زائد مال پر ہمارا کوئی حق نہیں ہے۔''

---

[1] بخاری، کتاب مواقیت الصلاة، باب السَّمر مع الأهل والضيف، رقم: ٦٠٢۔

[2] بخاری، کتاب المظالم، باب لا يظلم المسلم المسلم ولا يسلمهُ، رقم: ٢٤٤٢؛ مسلم، کتاب البر والصلة والأدب، باب تحريم ظلم المسلم وخذله، رقم: ٦٥٤١؛ ابوداود، کتاب الأدب، باب المؤاخاة، رقم: ٤٨٩٣؛ ترمذی، کتاب الحدود، باب ماجاء فی الستر علی المسلم، رقم: ١٤٢٦؛ مسند احمد: ٢/ ٦٨، رقم: ٥٣٣٤۔

[3] مسلم، کتاب اللقطة، باب إستحباب المؤاساة بفضول المال، رقم: ٤٥١٧؛ ابوداود، کتاب الزكاة، باب فی حقوق المال، رقم: ١٦٦٣؛ مسند احمد: ٣/ ٣٤، رقم: ١٠٩٠٠۔

علامہ ابو محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک عمومی اور اتفاقی حکم ہے۔''

حدیث کا یہی اسوہ اور نمونہ ہمارے لیے کافی ہے۔

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اَطْعِمُوا الْجَائِعَ وَفُكُّوا الْعَانِيَ)) [1]

''بھوکے کو کھانا کھلاؤ اور تھکے ہارے پریشان کی مدد کرو۔''

اس مفہوم کی بے شمار روایتیں بطور تائید پیش کی جاسکتی ہیں۔

آثار صحابہ رضی اللہ عنہم

حضرت ابو وائل شقیق بن سلمہ کہتے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ (کبھی حسرت کے ساتھ) کہا کرتے تھے: ''(تجربے اور مشاہدے سے) جو آج مجھے معلوم ہوا، اگر پہلے سے اس کا علم ہوتا تو میں پہلا کام یہ کرتا کہ مالداروں کا فاضل سرمایہ ان سے لے کر غریب مہاجرین میں تقسیم کردیتا۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''باری تعالیٰ نے ہر بستی کے مالداروں پر اس قدر امداد فرض قرار دی ہے جس سے وہاں کے غریبوں کی کفالت ہوسکے، اس کے باوجود اگر کسی بستی میں غریبوں کی خستہ حالی پاؤ تو سمجھ لو کہ اس بستی کے امیروں نے ان کے ساتھ حسن سلوک میں ضرور کوتاہی کی ہے، انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ خداوند عالم قیامت کے روز ان سے باز پرس کرے گا اور قرار واقعی سزا دے گا۔'' عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں، مال میں زکوٰۃ کے سوا بھی کچھ حق ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، حضرت حسن بن علی اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم سے

---

[1] بخاري، كتاب الجهاد، باب فكاك الأسير، رقم: ٣٠٤٦؛ دارمي، كتاب السير، باب في فكاك الأسير، رقم: ٢٤٦٥؛ مسند احمد: ٤/ ٣٩٤، رقم: ١٩٠٢٣۔

روایت ہے کہ انہوں نے ایک سائل کے جواب میں یک زبان ہو کر کہا تھا:

''اگر تمہیں مانگنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ تمہیں خون ناحق میں پھانس لیا گیا یا تم قرض میں گرفتار ہو یا فقر و ناداری کا شکار ہو تو تمہارا سوال کرنا درست ہے۔''

حضرت ابو عبیدہ بن جراح اور ان کے تین سو ساتھی صحابہ کے بارے میں یہ واقعہ صحیح ہے کہ جب ان کا توشہ ختم ہوا تو حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے بچا کھچا ایک توشہ دان میں جمع کرنے کا حکم فرمایا، ساتھیوں نے یہی کیا، پھر روزانہ ہر ساتھی کو برابر برابر تقسیم فرماتے، امیر قافلہ کے اس فیصلہ پر صحابہ نے اتفاق کیا، جو اس کے اجماع ہونے کی دلیل ہے۔

امام شعبی، مجاہد، طاؤس رحمۃ اللہ علیہم اور ان کے علاوہ دیگر کبار علما اس کے قائل تھے کہ ''مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی کچھ حق ہے۔''

علامہ ابو محمد رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

''جہاں تک ہمیں معلوم ہے، ضحاک ابن مزاحم کے سوا کسی اور نے اس متفقہ فیصلہ سے اختلاف نہیں کیا...... انہوں نے البتہ کہا ہے کہ زکوٰۃ نے مال کے اندر عائد کئے گئے دیگر حقوق کو منسوخ کر دیا ہے۔ علامہ موصوف کہتے ہیں، رہے ضحاک بن مزاحم، تو ان کے بارے میں عام رائے یہ ہے کہ ان کا قول تو درکنار، ان کی روایت بھی ناقابلِ اعتبار ہے۔

علاوہ ازیں انہوں نے خود پہلے اس مسئلہ کی تائید کی اور کہا کہ ''مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی کچھ حقوق ہیں، جیسے محتاج ماں باپ کا نفقہ، بیوی کا نفقہ، غلام اور جانوروں کے اخراجات، قرض اور تاوان کی ادائیگی وغیرہ (جیسے دیت، خون بہا اور نقصان عیب وغیرہ)

اس طرح مسئلہ کی پہلے تائید، پھر بعد میں اختلاف سے ان کا دعویٰ خود بخود کمزور ہو جاتا ہے۔

باب ہشتم

صدقہ وخیرات

☆...... اوقاف

☆...... ایک قدیم وقف

☆...... خلاصہ

چھٹا ذریعہ......صدقہ وخیرات

غریبوں کے حقوق کو آئینی حیثیت عطا کرنے کے ساتھ ساتھ اسلام کی شروع سے یہ کوشش رہی ہے کہ انسان خصوصاً مسلمان کے اندر خیر خواہی اور سخاوت کا ایسا جذبہ پیدا کیا جائے کہ وہ مطالبہ سے کچھ زیادہ ہی دینے کا رجحان رکھتا ہو، بلکہ اس کا عزم اس قدر جوان ہو کہ بغیر طلب کئے اس کے اندر دینے کا جذبہ موجزن ہو، خوشی ہو یا غم، اس کی داد و دہش میں کوئی فرق نہ آتا ہو، وقت بے وقت وہ اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتا ہو۔ اگرچہ خود سخت ضرورت میں گھرا ہو، اس کی نظروں میں دولت وسیلہ اور ذریعہ ہو، منزل اور انتہا نہ ہو، پھر یہ سب اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہو، نہ اسے عزت و مرتبہ کی لالچ ہو نہ ہی داد و دہش کی کوئی پروا ہو۔

ہمارے اردگرد کچھ لوگ ایسے ہیں، جو سمجھتے ہیں کہ قانون کے ڈنڈے کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ان کا خیال غلط ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ درحقیقت انہوں نے انسان کو سمجھا نہیں۔ اس لیے کہ انسان کوئی لٹو ہرگز نہیں جو گھمانے سے گھومنے لگے، یا ایسا کھلونا نہیں جو چابی دینے سے حرکت کرے، ورنہ چپ چاپ کھڑا رہے۔ دراصل انسان کائنات بسیطہ کا سب سے پیچیدہ پرزہ ہے، جس کے اجزائے ترکیبی میں جسم اور روح، عقل اور شعور، جذبات اور احساسات سبھی کا حسین امتزاج ہوتا ہے۔

اب ان اوصاف سے متصف شئے کو مدنظر رکھ کر یقیناً یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ہر پہلو سے انسان پر اثر ڈالا جائے، اس کے ضمیر اور اس کی خفتہ اخلاقی قدروں کو جھنجوڑا جائے، نہ یہ کہ قانون کے ڈنڈے سے محض اس کی گوشمالی کی جائے۔

اسلام جیسے عالمگیر مذہب کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ قانونی ذرائع کو اس کا مقام عطا کرتے ہوئے اخلاقی قدروں کو اجاگر کرتا، اس لیے کہ یہ ہر کوئی جانتا ہے کہ برادری اور

سماج میں اشتراک وتعاون کا جذبہ محض قانون بنادینے سے پیدا نہیں ہوتا، بلکہ اس کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس کی اخلاقی اور انسانی ذمہ داری اس کو یاد دلائی جائے، اسے یاد دلایا جائے کہ خیر خواہی اور باہمی ہمدردی وہ جوہر ہے جسے اپنا کر بندہ خدا کی مرضی اور جنت میں انبیا وصالحین کی ہم نشینی کا شرف حاصل کر سکے گا اور مادی فائدہ یہ ہوگا کہ تنگ دستی اور ناداری کی لعنت سے دنیا پاک ہو سکے گی۔

قرآن پاک نے جن امور کو خاص طور پر اپنا موضوع قرار دیا اور بار بار جن کی تاکید کی، ان میں سے ایک خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب ہے۔ یہ بارہا ہوا کہ قرآن پاک نے اس کی تلقین کی اور حرص وبخل سے ڈرایا اور دھمکایا، پھر انتہائی خوبی اور صفائی کے ساتھ بلیغ ادبی پیرائے میں دل کش اور مؤثر تمثیلیں پیش کیں۔ جن سے سخت دلوں میں رقت اور بند مٹھیوں میں حرکت پیدا ہو اور داد ودہش کی راہیں خود بخود کھل جائیں۔ ہم یہاں اس قسم کی صرف ایک آیت پر اکتفا کرتے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ ﴾ (۲/ البقرة: ۲۶۱، ۲۶۲)

''اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ جس سے سات بالیاں اگتی ہیں، ہر بالی میں سینکڑوں دانے ہوتے ہیں اور اللہ جسے چاہتا ہے، مزید عطا کرتا ہے اور اللہ بڑی وسعت اور بڑا جاننے والا ہے، جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، پھر خرچ کرنے کے بعد نہ تو احسان جتلاتے ہیں اور نہ ستاتے ہیں، ان لوگوں کو ان کے اعمال کا

ثواب ان کے پروردگار کی طرف سے ملے گا اور قیامت کے دن نہ ان کو خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً ؕ وَ اللّٰهُ یَقْبِضُ وَ یَبْصُۜطُ ۪ وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ۝﴾ (۲/ البقرۃ:۲۴۵)

''ہے کوئی ایسا جو اللہ کو اچھے طریقے سے قرض دے، پھر اللہ اس کے مال کو کئی گنا بڑھا دے اور اللہ روزی کو تنگ کرتا اور وہی کشادہ کرتا ہے اور تم سب اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہو۔''

﴿وَ سَارِعُوْۤا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ۝ۙ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَ الضَّرَّآءِ﴾

(۳/ آل عمران: ۱۳۳، ۱۳۴)

''اور اپنے پروردگار کی مغفرت اور جنت کی طرف لپکو جس کا پھیلاؤ آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔ یہ ان پرہیزگاروں کے لیے تیار کی گئی ہے جو خوشحالی اور تنگی میں (اپنا مال اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔''

﴿قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَ یَقْدِرُ لَهٗ ؕ وَ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَهُوَ یُخْلِفُهٗ ۚ وَ هُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ۝﴾ (۳۴/ سبا:۳۹)

''(اے پیغمبر ﷺ! ان سے) کہہ دو کہ میرا پروردگار اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے، روزی کشادہ کر دیتا ہے اور (جس کے لیے چاہتا ہے) تنگ کر دیتا ہے، اور تم جو خرچ کرتے ہو وہ اس کا عوض دیتا ہے اور وہ بہتر رزق دینے والا ہے۔''

﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِیْنَ فِیْهِ ؕ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ اَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِیْرٌ۝﴾ (۵۷/ الحدید:۷)

''اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، اور جس مال میں اس نے تم کو

جانشین بنایا ہے اس میں سے خرچ کرو، جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور مال خرچ کرتے رہے، ان کے لیے بڑا ثواب ہے۔''

﴿ وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِۦ فَأُولَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْمُفْلِحُونَ ﴾ (۵۹/ الحشر:۹)

''اور ان کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ خود ان کو فاقہ ہو اور جو شخص اپنے نفس کے بخل سے بچالیا گیا تو ایسے ہی لوگ مراد پانے والے ہیں۔''

﴿ وَمَا تُقَدِّمُوا۟ لِأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِندَ ٱللَّهِ هُوَ خَيْرًا وَأَعْظَمَ أَجْرًا ۚ ﴾ (۷۳/ المزمل:۲۰)

''اور جو نیک عمل تم اپنے لیے آگے بھیجو گے اسی کو اللہ کے یہاں پہنچ کر اس سے اچھا اور ثواب میں بڑا پاؤ گے اور اللہ سے بخشش مانگتے رہو، بلاشبہ اللہ بخشنے والا (اور بڑا) مہربان ہے۔''

﴿ وَيُطْعِمُونَ ٱلطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِۦ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ۝ إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ ٱللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَآءً وَلَا شُكُورًا ۝ إِنَّا نَخَافُ مِن رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوسًا قَمْطَرِيرًا ۝ ﴾ (۷۶/ الدھر:۸تا۱۰)

''یہ لوگ محض اللہ کی محبت میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں (اور کہتے ہیں) ہم تم کو خالص اللہ کے لیے کھلاتے ہیں، نہ تم سے عوض کے خواستگار ہیں اور نہ شکرگزاری کے، ہم کو اپنے پروردگار سے اس دن کا ڈر ہے جو نہایت اداس اور بہت سخت ہوگا۔''

﴿ فَلَا ٱقْتَحَمَ ٱلْعَقَبَةَ ۝ وَمَآ أَدْرَىٰكَ مَا ٱلْعَقَبَةُ ۝ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ أَوْ إِطْعَٰمٌ فِى يَوْمٍ ذِى مَسْغَبَةٍ ۝ يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ أَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝ ثُمَّ كَانَ مِنَ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَتَوَاصَوْا۟ بِٱلصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا۟ بِٱلْمَرْحَمَةِ ۝ أُو۟لَٰٓئِكَ أَصْحَٰبُ ٱلْمَيْمَنَةِ ۝ ﴾ (۹۰/ البلد:۱۱تا۱۸)

''تو وہ دین کی گھاٹی سے ہو کر نہ گزرا اور تم کو کچھ معلوم ہے کہ گھاٹی کیا ہے، (گھاٹی سے مراد یہ ہے کہ) کسی کی گردن کا (غلامی یا قرض کے پھندے سے) چھڑانا، یا بھوک کے دن رشتہ دار یتیم کو یا خاک نشین محتاج کو کھانا کھلانا، (اس کو چاہیے تھا کہ یہ کام اختیار کرتا اور) پھر ان لوگوں میں سے ہوتا جو ایمان لائے اور ایک دوسرے کو صبر کی ہدایت دیتے رہے اور ایک دوسرے کو رحم کرنے کی نصیحت کرتے رہے، یہی لوگ مبارک (اور خوش نصیب) ہیں۔''

قرآن پاک کی طرح سرور عالم ﷺ نے بھی اپنے فرمودات میں اس موضوع کو اہمیت دی۔

آپ ﷺ نے فرمایا:

((يَقُوْلُ الْعَبْدُ مَالِيْ مَالِيْ وَاِنَّمَا لَهُ مِنْ مَالِهٖ ثَلَاثٌ، مَا أَكَلَ فَأَفْنٰى أَوْلَبِسَ فَأَبْلٰى أَوْ اَعْطٰى فَاقْتَنٰى وَمَا سِوٰى ذٰلِكَ فَهُوَ ذَاهِبٌ وَتَارِكُهُ لِلنَّاسِ)) [1]

''آدمی کہتا ہے، میرا مال، میرا مال، حالانکہ اس کا مال بس وہی ہے، جو اس کے پیٹ میں گیا اور ہضم ہو گیا یا جسے اس نے پہن لیا اور وہ بوسیدہ ہو گیا یا پھر اس نے خدا کی راہ میں کچھ خیرات کی اور وہ اس کے لیے آخرت میں ذخیرہ بن گئی، ورنہ یاد رکھو، اس کے علاوہ ساری دولت یا تو ہاتھ سے نکل جائے گی، یا وہ خود اس دار فانی سے کوچ کر جائے گا اور اس کے مال پر اس کے ورثاء قبضہ کر لیں گے۔''

آپ ﷺ نے فرمایا:

[1] مسلم، كتاب الزهد والرقاق، باب الدنيا سجن للمؤمن وجنة للكافر، رقم: ٧٤٢٢؛ ترمذی، كتاب الزهد، باب منه حديث يقول ابن آدم مالی مالی، رقم: ٢٣٤٢؛ نسائی، كتاب الوصايا، باب الكراهية فی تأخير الوصية، رقم: ٣٦٤٣؛ مسند احمد: ٢/ ٣٦٨، رقم: ٨٥٩٥۔

((مَامِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا سَيُكَلِّمُهُ اللّٰهُ لَيْسَ بَيْنَهُ وَ بَيْنَهُ تَرْجُمَانٌ فَيَنْظُرُ أَيْمَنَ مِنْهُ فَلَا يَرَىٰ إِلَّا مَا قَدَّمَ وَيَنْظُرُ أَشْأَمَ مِنْهُ فَلَا يَرَىٰ إِلَّا مَا قَدَّمَ وَيَنْظُرُ بَيْنَ يَدَيْهِ فَلَا يَرَىٰ إِلَّا النَّارَ تِلْقَاءَ وَجْهِهِ فَاتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ)) [1]

"قیامت کے دن تم سے ہر کوئی خدا سے اس طرح ہمکلام ہوگا کہ اس کے اور خدا کے درمیان کوئی ترجمان نہ ہوگا، اس دن جب وہ اپنے دائیں بائیں دیکھے گا، تو حدِ نظر تک اپنے اعمال اسے نظر آئیں گے جو اس دن کے لیے اس نے کیے تھے، اس کے سامنے جہنم دہکتی ہوگی، بس اسی جہنم سے بچنے کی کوشش کرو، جس کی آسان سی تدبیر یہ ہے کہ خدا کی راہ میں خرچ کرو، خواہ آدھی کھجور ہی کیوں نہ دے سکو۔"

شق تمرة: نصف کھجور کو کہتے ہیں، یعنی جتنا میسر ہو، خواہ کم سے کم ہو، خیرات کردو۔

آپ ﷺ نے یہ فرمایا:

"تم میں سے کوئی ہے جسے اپنا مال اپنے وارث کے مال سے کہیں زیادہ پسند ہو؟" صحابہ نے عرض کیا، حضور! ہمیں تو اپنا ہی مال پسند ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: "(تو جان لو کہ) آدمی کا اپنا مال وہ ہے جو اس نے آگے کے لیے روانہ کر دیا اور جو رہ گیا وہ اس کے ورثاء کا ہوگا۔" [2]

نیز فرمایا:

"جس نے حلال کمائی سے (خواہ) ایک کھجور (یا اس کی قیمت) خیرات کی۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ حلال اور پاکیزہ کمائی کو ہی پسند کرتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اپنے دستِ خاص سے

[1] بخاری، کتاب الرقاق، باب من نوقش الحساب عذب، رقم: ٦٥٣٩؛ مسلم، کتاب الزکاة، باب الحث علی الصدقة ولو بشق تمرة، رقم: ٢٣٤٨؛ ترمذی، کتاب صفة القیامة، باب فی القیامة، رقم: ٢٤١٥؛ مسند احمد: ٤/ ٢٥٦، رقم: ١٧٧٨٢۔

[2] بخاری، کتاب الرقاق، باب ماقدم من ماله فهو له، رقم: ٦٤٤٢؛ نسائی، کتاب الوصایا، باب الکراهیة فی تأخیر الوصیة، رقم: ٣٦٤٢۔

اس کو قبول کرتا ہے اور اس شخص کی خاطر اس کی اس طرح پرورش کرتا ہے جیسے کوئی پہلے پہل پیدا ہونے والے بچھڑے کی پرورش کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ پہاڑ کے برابر ہو جاتا ہے۔“ [1]

حضور ﷺ نے فرمایا:

”خیرات لغزشوں کو اس طرح زائل کر دیتی ہے جیسے پانی آگ کو بجھا دیتا ہے۔“ (ابو یعلی)

آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: ”(قیامت کے دن) ہر کوئی اپنی خیرات کے سائے میں ہوگا، تا آنکہ فیصلہ ہو جائے۔“ [2]

ایک مرتبہ آپ ﷺ نے فرمایا:

”ایک درہم لاکھ درہم سے بڑھ گیا!“ ایک شخص نے عرض کیا، حضور یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ”ایک شخص بڑا دولت مند ہے، اس نے کثیر مال میں سے لاکھ درہم نکال کر خیرات کر دیا، دوسرے شخص کے پاس فقط دو درہم ہیں، اس نے ایک اللہ کی راہ میں خیرات کر دیا۔ (یہ ایک درہم اس لاکھ درہم سے بڑھ گیا)۔“ [3]

لیکن ہمارے قارئین اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں پر ان آیات اور احادیث کا اثر بس معمولی سا رہا، پھر ان کی زندگی اسی نہج پر گزر گئی، جو پہلے سے چلی آ رہی تھی، اس غلط فہمی کے ازالے کے لیے اسلامی تاریخ کے چند واقعات یہاں ذکر کیے جاتے ہیں۔ جن سے بخوبی اندازہ ہوگا کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا جذبہ صحابہ کے دلوں میں کس قدر موجزن تھا۔

مفسرین نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ جب ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ﴾ (۲/ البقرة:۲۴۵) کی آیت نازل ہوئی، تو ابو دحداح انصاری رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، یارسول اللہ ﷺ! کیا ہم سے خدا قرض طلب کرتا ہے؟ آپ نے جواب میں فرمایا: ”ہاں!“ ابو دحداح نے کہا، خدا کی قسم، مجھے اپنا دست مبارک دکھایئے۔ آپ نے اپنا ہاتھ

[1] مسند احمد: ۲/ ۴۷۱، رقم: ۹۷۳۸۔ [2] ترمذی، کتاب الایمان، باب ما جاء فی حرمة الصلاة، رقم: ۲۶۱۶؛ ابن ماجة، کتاب الزهد، باب الحَسَد، رقم: ۴۲۱۰؛ مستدرك حاكم، كتاب الزكاة، رقم: ۱۵۱۷ ج ۲ ص: ۵۸۶۔ [3] نسائی، کتاب الزکاة، باب جهد المقلّ، رقم: ۲۵۲۹؛ مستدرك حاكم، كتاب الزكاة، رقم: ۱۵۱۹ ج ۲ ص: ۵۸۷۔

ان کے ہاتھ میں دے دیا۔ انہوں نے دست مبارک تھام کر کہا، میں نے اپنا باغ اللہ کے حوالے کیا۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ان کا یہ باغ کھجور کے چھ سو درختوں پر مشتمل تھا، ان کے بیوی بچے اسی باغ میں رہا کرتے تھے، جب ابو دحداح رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس سے اٹھ کر باغ میں پہنچے تو دور سے آواز دی، ام دحداح! اندر سے بیوی نے کہا، میں حاضر ہوں، آپ نے فرمایا، باغ خالی کردو، میں نے اسے خداوند عالم کو سونپ دیا ہے۔ [1]

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کا باغ مدینہ کا سب سے بڑا باغ تھا، اس کا نام بیرحاء تھا، وہ انہیں بڑا محبوب تھا، مسجد نبوی کے قریب تھا، پانی بھی نہایت شیریں اور افراط تھا، جب قرآن پاک کی آیت لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ ...... نازل ہوئی تو ابوطلحہ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا، خدا کا ارشاد ہے کہ محبوب مال اللہ کے راستے میں خرچ کرو۔ اس لیے میں بیرحاء آپ کے حوالے کرتا ہوں۔ آپ جیسا مناسب سمجھیں اس کے موافق اس کو خرچ فرمائیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی مسرت کا اظہار فرمایا اور فرمایا کہ ''بہت عمدہ مال ہے۔ میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ تم اسے اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں میں بانٹ دو۔'' چنانچہ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے یہی کیا اور اپنے رشتہ داروں میں اسے تقسیم کر دیا۔ [2]

یہ اور اس طرح کی بیش بہا اور گراں قدر خیرات وصدقات اسلام کے ہر دور میں خداترس مسلمان کرتے رہے۔ بلاشبہ انہوں نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ خدا اور رسول اور اس کی خوشنودی کے مقابلے میں سونے چاندی کے ڈھیر اور دنیا کی ہر چیز ان کی نظر میں ہیچ ہے۔

امام لیث بن سعد رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں مشہور ہے کہ ہزار دینار روزانہ کی آمدنی تھی، اس کے باوجود ان پر زکوٰۃ فرض نہ ہوتی تھی، جس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے پاس جو آتا سب خیرات کر دیتے اور کچھ باقی نہ چھوڑتے جس پر زکوٰۃ واجب ہوتی! یہ بھی روایت ہے

[1] تفسیر ابن کثیر، سورة البقرة، آیت: ۲۴۵ ج۱ ص: ۳۱۷۔

[2] تفسیر ابن کثیر، سورۃ آل عمران آیت: ۹۲ ج۱ ص: ۴۱۵۔

کہ روزانہ صبح تین سو ساٹھ فقیروں کو خیرات دیتے، پھر کوئی کام کرتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک عورت نے ان سے تھوڑی سی شہد مانگی انہوں نے ایک مشکیزہ شہد اسے عطا کر دی، کسی نے کہا اس کے لیے تھوڑی سی شہد کافی تھی، آپ نے جواب دیا، اس نے اپنی ضرورت کے مطابق مانگا۔ ہم نے بتوفیق الٰہی دیا، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ ہر فقیر کو خیرات دیتے، اعتراض کئے جانے پر فرمایا، خدا نے مجھے دینے کی اور لوگوں کو مجھ سے لینے کی عادت دے رکھی ہے، مجھے ڈر ہے کہ میں باز آیا تو خدا بھی دینے سے باز آئے گا۔

اوقاف

ایک اور صدقہ جس کی طرف اسلام نے بے حد توجہ دلائی، اوقاف یا صدقہ جاریہ کہلاتا ہے۔ صدقہ جاریہ کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ صدقہ کرنے والے کی وفات کے بعد بھی اس صدقہ کا ثواب اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ملا کرتا ہے اور یہ سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوتا۔

((اِذَا مَاتَ الْاِنْسَانُ، اِنْقَطَعَ عَمَلُهُ اِلَّا مِنْ ثَلَاثَةِ اَشْيَاءَ مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ اَوْ عِلْمٍ يُّنْتَفَعُ بِهٖ اَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُوْلَهٗ)) [1]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب آدمی مرجاتا ہے تو اس کے تمام اعمال کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔ البتہ تین اعمال کا سلسلہ مرنے کے بعد بھی ختم نہیں ہوتا۔ صدقہ جاریہ، علم، جس سے بعد والے فائدہ اٹھائیں، صالح اولاد، جو اس کے حق میں دعائے خیر کرتی رہے۔''

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ نقل کرتے ہیں کہ جب

---

[1] مسلم، کتاب الوصیة، باب ما یلحق الانسان من الثواب بعد وفاته، رقم: ٤٢٢٣؛ ابوداود، کتاب الوصایا، باب ما جاء فی الصدقة عن المیت، رقم: ٢٨٨٠؛ ترمذی، کتاب الأحکام، باب ما جاء فی الوقف، رقم: ١٣٧٦؛ ابن ماجة، کتاب السنة، باب ثواب معلم الناس الخیر، رقم: ٢٤١؛ نسائی، کتاب الوصایا، باب فضل الصدقة عن المیت، رقم: ٣٦٨١۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خیبر کی ایک زمین حصہ میں ملی، تو خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اب تک اللہ نے مجھے جو کچھ دیا اس میں خیبر کی یہ زمین مجھے بے حد پسند آئی، میں چاہتا ہوں کہ اسے خدا کی راہ میں خیرات کر دوں، بتایئے میں کس طرح کروں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''چاہو تو اصل زمین اپنے قبضہ میں رہنے دو اور اس کی آمدنی خیرات کرتے رہو۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہی کیا اور زمین کو غریبوں، مسافروں اور ناداروں کے لیے وقف کر دیا، اوقاف کا یہ ایک نمونہ جسے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمایا۔ اس میں شک نہیں کہ آئندہ چل کر ہر دور میں غریب مسلمانوں کے لیے حد درجہ نفع رساں رہا اور ملک وملت کے بڑے بڑے کام ان سے نکلتے رہے۔ امت کے اہل خیر حضرات کی بھی بیدار مغزی تھی کہ انہوں نے اوقاف کی طرف خصوصی توجہ دی، یہاں تک کہ ہمارے اسلاف کی تاریخ بتاتی ہے کہ انہوں نے اوقاف کی فاضل آمدنی سے بیمار جانوروں اور آوارہ کتوں کی بھی خوراک کا بندوبست کیا، غور کرنا چاہیے کہ بے زبان جانوروں کے ساتھ جب ان کا برتاؤ یہ تھا، تو انسانوں کے ساتھ ان کا برتاؤ کیا رہا ہوگا، جو بہر حال اشرف المخلوقات ہیں۔

ایک قدیم وقف

ذیل میں ہم ایک تاریخی دستاویز کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں۔ اس کا تعلق اس زمانے سے ہے جب مصر پر خاندانِ غلاماں کی حکومت تھی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب ۱۲۵۰ء میں قاہرہ کے تخت پر الملک المنصور قلاوون کی حکومت تھی، جس نے آخری صلیبی معرکوں میں عیسائیوں کو شکست دی تھی اور ان کے قبضے میں جو قلعے رہ گئے تھے، انہیں بھی چھین لیا تھا۔ وقت کے ایک صاحب خیر اور اہل ثروت مسلمان نے بادشاہ وقت کے نام پر ایک دواخانہ قائم کیا، اس وسیع تر دواخانے کی بنیاد ۱۲۸۵ء میں سلطان قلاوون نے اپنے ہاتھوں سے رکھی اور ۱۲۹۳ء میں اس کے بیٹے سلطان ناصر کے زمانے میں اس کی تکمیل ہوئی۔ (بحوالہ لیس من الاسلام ص ۲۴۔۲۵)

مذکورہ بالا دستاویز اسی دواخانے سے متعلق ہے۔ اس میں وقف کنندہ نے اوقاف

سے متعلق تفصیل اور اس کا طریق کار مفصل ذکر کیا۔ دستاویز کا ایک ٹکڑا حسب ذیل ہے:

☆...... یہ دواخانہ تمام مسلمان مردوں اور عورتوں کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ قاہرہ اور اس کے مضافات میں آباد سرمایہ دار اور نادار ہر کوئی اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

☆...... دواخانہ کا افسر اعلیٰ اس بات کا مجاز ہوگا کہ اوقاف کی آمدنی سے بیماروں کے لیے چارپائی اور آرام دہ بستروں کا معقول انتظام کرے۔

☆...... اس دواخانے کا ایک نجی باورچی خانہ ہوگا، جس میں مریضوں کے پرہیزی یا ضروری غذائیں جیسے مرغ و ماہی، یا چوزوں اور پرندوں کا گوشت وغیرہ پکوانے کا مکمل انتظام ہوگا۔

☆...... ہر بیمار کے لیے حسب ضرورت برتن وغیرہ علیحدہ علیحدہ مہیا کیے جائیں گے۔ ان میں سے ایک کا برتن کسی دوسرے کو برائے استعمال نہیں دیا جائے گا۔

☆...... ناظر کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ مصارف کی پروا کیے بغیر ایسے قابل مسلمان اطباء کا تقرر کرے۔ جو پوری عرق ریزی اور خیر خواہی کے جذبہ سے ہر مریض کا اطمینان بخش علاج کریں اور صبح و شام دونوں وقت ان کا معائنہ کرتے رہیں۔ اور ان کے سرہانے آویزاں رجسٹر پر ان کا نام، عمر، بیماری، مجوزہ دوائیں اور پرہیز تحریر کرتے رہیں۔

☆...... اطباء کے لیے ضروری ہوگا کہ ان میں سے کوئی ایک، یا ایک سے زائد روزانہ دواخانہ میں بسر کریں اور مریضوں کی خاطر خواہ نگرانی کریں۔

اور اپنی کسی خدمت، یا دواخانے سے دی گئی کسی دوا یا غذا کا معاوضہ، کسی مریض سے کسی حال میں قبول نہ کریں۔

☆...... دواخانے میں برسر خدمت ہر فرد کے لیے لازم ہے کہ اپنے دل میں خدا کا خوف اور خدمت خلق کا سچا جذبہ پیدا کرے اور یہ یاد رکھے کہ اپنے فرائض میں کسی قسم کی کوتاہی اگر اس نے کی تو خدا کے سامنے اسے جواب دینا ہوگا۔

غور کرنا چاہیے کہ یہ دستاویز اسلام کے عہد زریں سے بہت بعد کے اس دور سے

تعلق رکھتی ہے، جسے عام طور پر مسلمانوں کی زبوں حالی اور پستی کا زمانہ سمجھا جاتا ہے۔

خلاصہ

یہ چھ تدابیر جن کا تفصیلی ذکر گزشتہ صفحات میں کیا گیا۔ اسلام کی نظر میں غریبی کا مکمل علاج ہیں۔ مزید آسانی اور اختصار کے لیے ہم انہیں تین بنیادی وسائل کے طور پر ذیل میں درج کرتے ہیں۔

پہلا ذریعہ

اس تدبیر کا تمام تر تعلق ہر غریب آدمی کی ذات سے ہے، غریبوں کی خفتہ صلاحیتوں کو بیدار کر کے انہیں اسکا پابند کیا جاتا ہے کہ اگر ان کے اندر صلاحیت ہو، اور کام کے مواقع انہیں حاصل ہوں تو انہیں حرکت وعمل سے دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ نیز مقامی حاکم یا اس کے گرد موجود سماج کے سرکردہ افراد کو یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ ہر ایسے فرد کو سہارا دیں اور مالی تعاون یا مناسب تربیت کی ضرورت ہو تو اس کی فراہمی میں غفلت سے کام نہ لیں

دوسرا ذریعہ

اس کے مخاطب اسلامی معاشرہ اور اس کے سرکردہ مسلم افراد ہیں، جو غریبوں کی امداد اور ان کے ساتھ تعاون کو فرض جان کر کرتے ہیں اور اس امید پر کہ آخرت میں باری تعالٰی اجر وثواب سے نوازے گا، تعاون اور امداد باہمی کی مختلف تدابیر کو از خود تلاش کیا کرتے ہیں۔ ان کے لیے تعاون کی بعض صورتیں یہ ہیں:

(الف)...... قرابت داروں کے لیے وظائف۔

(ب)...... پڑوسیوں کے حقوق اور ان کے ساتھ خصوصی برتاؤ۔

(ج)...... اسلامی حکومت قائم نہ ہونے کی صورت میں از خود زکوٰۃ کی جمع وتقسیم۔

(د)...... زکوٰۃ کے علاوہ دیگر حقوق جیسے، کفارات، نذر، ہنگامی امداد محتاجوں کی اعانت، وغیرہ۔

(ہ)...... صدقات وخیرات، صدقہ جاریہ، اوقاف۔

تیسرا ذریعہ

اس ذریعہ کے مخاطب دراصل مسلم حکمران، یا اسلامی حکومتیں ہیں، انہیں یہ یاد دلایا جاتا ہے کہ نادار بے سہارا اور بے روزگار افراد خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، ان کی ہمہ قسم کی دستگیری اور اعانت ان کا فرض منصبی ہے۔

اس صیغے میں آمدنی کے ذرائع حسب ذیل ہوں گے:

(الف) زکوۃ، بیت المال کی آمدنی کا اہم ترین ذریعہ، جو اسلامی نقطۂ نظر سے غریبی کے ازالے کا سب سے طاقتور ذریعہ ہے۔

(ب) مالیات کے دیگر مقررہ ذرائع، جیسے مال غنیمت کا پانچواں حصہ، فے (وہ زمین یا جائیداد جو غیر مسلموں سے جنگ کئے بغیر حاصل ہو) خراج، جزیہ، گمشدہ اسباب، لاوارث کا ترکہ، حکومت کی مملوکہ اراضی وغیرہ۔

(ج) ہنگامی ذرائع، کسی ناگہانی مصیبت کے وقت، زکوۃ اور دیگر آمدنی سے غریبوں کی امداد نہ ہونے کی صورت میں مالداروں سے مزید وصولی۔

باب نہم

☆...... غربت ہٹاؤ کی بنیادی شرط

☆...... اسلامی ماحول کیوں؟

☆...... اسلامی نظام پیداوار کو بڑھاتا ہے اور غربت کو کم کرتا ہے

☆...... ناقابل شکست نظام

☆...... اسلام میں غریب طبقہ کا وجود نہیں

☆...... عزت نفس کی حفاظت

☆...... غربت کا خاتمہ

غریبی ہٹاؤ کی بنیادی شرط

بلاشبہ یہ وسائل جنہیں اب تک پیش کیا گیا۔ اسلام کی نظر میں غریبی کا علاج ہیں، اسلام ان کے سہارے غریبوں کی کفالت، ان کی بنیادی ضروریات کی تکمیل اور ان کی عزت نفس کی حفاظت کی ضمانت دیتا ہے، لیکن اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ ان وسائل سے خاطر خواہ نتیجہ اس وقت برآمد ہوگا، یا دوسرے لفظوں میں یہ ذریعے اس وقت موثر ہوں گے جب ایک اسلامی حکومت قائم ہو اور ملک کے طول وعرض میں بسنے والے لوگوں پر، ان کی معاشرتی، اقتصادی، ثقافتی، سیاسی اور علمی، غرض ساری زندگی پر اسلامی دستور اور صرف اسلامی دستور کی چھاپ نمایاں ہو۔ یہ اس لیے کہ آپ خود سوچئے کیا کسی ایسے معاشرے میں اسلام کے ان اصولوں سے غریبی کا انسداد ممکن ہے جس کے جملہ شعبوں پر ایک ایسا انوکھا نظام مسلط ہو، جو یا تو سارے کا سارا باہر سے درآمد کیا گیا ہو یا جس میں ادھر ادھر سے کچھ اصول اور ضابطے لے کر ان میں اسلامی احکام کا پیوند لگا دیا جائے اور جب تدبیر کارگر نہ ہو تو ناکامی کی تمام تر ذمہ داری اسلام کے سر منڈھ دی جائے، غور کرنا چاہیے کہ اس الٹی منطق کو کیا عقل سلیم گوارا کرتی ہے یا حق اور انصاف کی رو سے یہ پیوند کاری درست ہو سکتی ہے۔

اسلام کا سماجی اور معاشرتی نظام دراصل زنجیر کی کڑیوں کی طرح باہم مربوط ہے۔ اس کے بعض گوشے براہ راست یا بالواسطہ اس قدر اہم ہیں کہ نہ انہیں نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور نہ غیر اہم سمجھ کر ان کے مقابلے میں دوسرے کو ترجیح دی جا سکتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ باری تعالیٰ نے مسلمانوں کو بار بار تاکید فرمائی:

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً ﴾ (۲/ البقرة:۲۰۸)

”اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔“

آیت کا پس منظر مسلمانوں کو یاد دلاتا ہے کہ وہ یہود و نصاریٰ کا طرز نہ اپنائیں جو چاہتے تھے نئے دین کو قبول کریں، لیکن اپنے قدیم آبائی عقائد کو بھی برقرار رکھیں۔ یہ اس

لیے کہ اسلام نہ اس پیوند کاری کو پسند کرتا ہے، نہ ہی ایسا ملا جلا نظام کسی مرض کے ازالے کے لیے سودمند اور مفید ثابت ہوسکتا ہے۔

اسلامی ماحول کیوں؟

دیکھنا چاہیے کہ غریبی ہٹاؤ کا پروگرام اسلامی نظام اور اسلامی طرز زندگی کو کیوں چاہتا ہے؟ مثال کے طور پر سب سے پہلے اس بات کو لیجئے کہ اسلام غریبی کے خلاف جنگ کے لیے محنت مشقت اور حرکت وعمل کو بنیادی ہتھیار قرار دیتا ہے، لیکن اگر ایک شخص ناجائز اور غلط پیشہ اپنا کر اپنی تمام تر توانائی اس میں صرف کرے تو کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کا یہ عمل صحیح ہے؟

ایک دوسرے شخص کو لیجئے وہ کوئی حرام کا کام نہیں کرتا، اس کی روزی پاکیزہ ہے اور خود بھی بڑی محنت کرتا ہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کا مالک اسے کم اجرت دیتا ہے، ٹال مٹول کرتا ہے، یا آئے دن اسے تنگ کرتا ہے۔ کیا مالک کا یہ رویہ قابل تعریف ہے؟

اس مالک کو چھوڑئے! دوسرے کو لیجئے جو اپنے مزدور کو بروقت پوری اجرت دیتا ہے، مگر مزدور کی روش یہ ہے کہ وہ آمدنی سے زیادہ فضول خرچی کرتا ہے اور آمدنی کا بڑا حصہ بیڑی، سگریٹ، سینما، قوالی اور رقص وسرود جیسی خرافات میں صرف کرتا ہے، جبکہ اس کے گھر میں فاقہ کی نوبت آتی ہے۔ کیا یہ مزدور داد کے لائق ہے؟

یا اسے بھی چھوڑیئے! مزدور یہ کچھ نہیں کرتا، لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ وہ جس سماج میں سانس لے رہا ہے۔ وہاں چور بازاری، ذخیرہ اندوزی، حد سے زیادہ نفع خوری اور کمرتوڑ گرانی ہے، سود دیئے بغیر اسے کوئی قرض نہیں دیتا، اور رشوت کے بغیر اس کا کوئی کام پورا نہیں ہوتا، اور اگر وہ عاجز اور درماندہ ہوکر قرض بھی لیتا ہے تو لاکھ کوشش کے باوجود وہ اسے لوٹا نہیں سکتا، بتایئے اب وہ کیا کرے؟

یہ اور اس قسم کی سینکڑوں مشکلات سے یہ احساس تیز ہوتا ہے کہ اگر ماحول غیر اسلامی ہو، یا حکومت غیر اسلامی ہو، تو محنت مشقت خواہ کسی قدر ہو، سب بیکار ہے، لیکن اگر

ماحول اسلامی اور حکومت بھی اسلامی ہو تو مزدور کی حیثیت کچھ اس طرح کی ہو گی۔

① اسلامی حکومت ہر فرد کے لیے روز گار فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ پیداوار میں مزید اضافے کے لیے مناسب تربیت اور ٹریننگ کا بندوبست کرے گی۔

② مذکورہ بالا مقاصد کے حصول کے لیے ہر شخص کو وہ کام سپرد ہو گا جو اس کی طبیعت کے عین مطابق ہو گا، تا کہ پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ ہو۔

③ ایسے آلات فراہم کیے جائیں گے، جس سے وقت اور محنت کی بچت کے ساتھ ساتھ صنعت وحرفت میں ترقی ممکن ہو سکے گی۔

④ ہر شخص کو اس کی صلاحیت، محنت اور ضرورت کے مطابق اجرت دی جائے گی اور اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے اس تک پہنچا دی جائے گی۔

⑤ تنخواہ ناکافی ہونے کی صورت میں بیت المال کی جانب سے اس کی باقی ماندہ ضروریات کی کفالت کی جائے گی۔

⑥ ناگہانی آفت یا مصیبت آن پڑنے کی صورت میں زکوۃ کے محفوظ سرمائے سے اس کی امداد اور دستگیری کی جائے گی۔

⑦ علاوہ ازیں اسے جتلایا جائے گا کہ اسلامی ماحول میں شراب وشباب، رقص و سرود اور عیاشی وفضول خرچی کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس سے گھر ویران اور زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔

اور اگر مکمل اسلامی حکومت کے تسلط کی بجائے، تھوڑی دیر کے لیے یہ فرض کر لیا جائے کہ آج کی کوئی نام کی مسلم حکومت، زکوۃ کے نظام کو جاری کرنا چاہے تو ہماری نظر میں اس کے جو اثرات مرتب ہوں گے وہ کچھ اس قسم کے ہوں گے:

☆...... حکومت وقت کو لوگ زکوۃ نہ دیں گے اس لیے کہ وہ نا اہل ہو گی یا وہ پہلے ہی سر سے پیر تک مختلف ٹیکسوں کے بوجھ سے دبے ہوں گے۔

☆...... عام مسلم رعایا زکوۃ دینے کی اہل نہ ہو گی، اس لیے کہ دوسری قوموں کی دیکھا

دیکھی وہ بھی لہو ولعب میں محو اور اسراف وفضول خرچی میں غرق ہوگی۔ نتیجے میں نہ انہیں زکوۃ جیسے اہم فریضے کا احساس ہوگا، نہ ہی بقدر نصاب سرمایہ ان کے پاس موجود ہوگا۔

☆...... بمشکل تمام اگر حکومت نے زکوۃ فراہم بھی کی، تو اس کا بڑا حصہ دفتری اور آئے دن کی کاک ٹیل اور ٹی پارٹیوں پر صرف ہوگا اور لامتناہی دفتری کارروائیوں کے بعد کہیں کسی شخص کا کچھ بھلا ہوگا۔

☆...... زکوۃ کی تقسیم کے وقت یہ شکایت عام ہوگی کہ مستحق محروم رہے اور غیر مستحق سب کچھ لے گئے۔

☆...... اور بالآخر ایوان حکومت میں کثرت رائے سے یہ تجویز پاس ہوگی کہ غریبی ہٹانے میں زکوۃ اور اس کی طرح اسلام کا سارا نظام بری طرح ناکام رہا، لہٰذا کسی دوسرے ازم کی کوئی اسکیم عمل میں لائی جائے۔

اسلامی حکومت اور غیر اسلامی حکومت کی مذکورہ بالا دونوں مثالوں سے بخوبی اندازہ ہوگا کہ اسلامی حکومت کی بجائے دوسری حکومت یا غیر اسلامی نظریے میں اسلامی احکام کی پیوندکاری سے نہ تو دوا کارگر ہوگی اور نہ ہی مرض کا ازالہ ہوگا۔

اسلامی نظام پیداوار کو بڑھاتا اور غریبی کو کم کرتا ہے

اسلامی نظام ملکی پیداوار میں افزائش اور فرد وملت کی قوت میں اضافہ کا باعث ہے۔ یہ نظام افراد کی طاقت ومحنت کی قدر کرتا ہے۔ دولت اور پیداوار کی حفاظت پر زور دیتا ہے اور اسے برباد کرنے یا فضول اور لغو کاموں میں استعمال کرنے سے سختی سے منع کرتا ہے۔ اس نظام میں شراب وشباب، نشہ بازی اور فضول شب بیداری، لہو ولعب اور چھوٹے بڑے، پوشیدہ اور کھلے، غرض کسی قسم کے گناہ میں حصہ لینے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس سے امت کی توانائی برباد اور گناہ لازم آتا ہے۔ اس سلسلے میں اسلام پیروانِ اسلام کو مناسب ہدایات کے ساتھ پاکیزہ تربیت دیتا ہے، تاکہ ان کے اندر صحت وسلامتی، نظامت اور پاکیزگی پیدا ہو اور وہ ہشاش بشاش اور چاک وچوبند ہو کر اپنے کام پر واپس

ہوں، جی لگا کر محنت کریں اور زیادہ اور بہتر طریقے پر کام کو انجام دیں۔

اس تربیت کا لازمی نتیجہ ہے کہ اس کے خوگر افراد جو صبح سویرے پاک وصاف باوضو ہو کر نماز وغیرہ سے فارغ ہو کر کام پر آتے ہیں، ان کی کارکردگی اور مزدوری کا تناسب ان سے کہیں زیادہ ہوتا ہے جو بے مہار اونٹ کی طرح آزاد ہوتے ہیں، جن کی راتیں ناچ رنگ کی محفلوں اور رقص وسرود کے عشرت کدوں میں گزرتی ہیں۔ جو بڑی مشکل سے صبح جگائے جانے پر افتاں وخیزاں بادل نخواستہ اپنے کام پر آتے ہیں۔ ظاہر ہے پہلی قسم کے افراد کے مقابلہ میں اس دوسرے گروہ کے کام کا معیار حد درجہ پست اور اس کے نتیجے میں پیداوار کی رفتار کارکردگی کی طرح انتہائی سست ہوگی۔

یہ نظام اگر اس کے اصولوں کو من وعن تسلیم کیا اور برتا گیا اس میں شک نہیں کہ اس کی بدولت ایک طرف دولت میں افزائش اور روزگار میں فراوانی ہوگی اور دوسری طرف فقر و ناداری سمٹ کر محدود ہوگی اور اگر خوش قسمتی سے مالدار طبقہ اس نظام کا خوگر بنا تو بلاشبہ غریبی کا علاج نہ صرف آسان، بلکہ عین ممکن ہے کہ اس مرض کا قصہ تمام ہوگا اور مسلم سماج کے اس درجہ استحکام کے ہوتے ہوئے کسی فرد یا گروہ کو کسی قسم کی شورش یا سازش کا موقع نہ ہوگا، جیسا کہ غیر مسلم ملکوں میں آئے دن سوشلزم اور کمیونزم کی آڑ میں شورشیں برپا ہوتی ہیں اور پرسکون ہنگامہ آرائی اور فتنہ وفساد کا اس طرح شکار ہوتا ہے کہ حق و ناحق میں امتیاز اٹھ جاتا ہے اور نتیجہ میں ظلم وفساد سے بھرا ہوا ایسا نظام رونما ہوتا ہے جو اوپر سے غریبی اور غریبوں سے ہمدردی کا لبادہ اوڑھے ہوتا ہے، لیکن درپردہ پہلے سے زیادہ غریبی و افلاس کو جنم دیتا ہے۔ چنانچہ ان کی شرپسندی اور فتنہ سامانی کی اس سے بڑھ کر دلیل اور کیا ہوگی کہ پہلے سماج کا ایک محدود طبقہ غریب کہلاتا تھا اور اب ان کے طفیل پورا سماج، پورا ملک اس مرض کا شکار اور معاشی ابتری میں گرفتار ہو کر رہ جاتا ہے۔

ناقابل شکست نظام

دراصل اسلامی نظام ناقابلِ شکست اور زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے

سے مربوط ہے۔ دوسرے اقتصادی نظام کے مقابلہ میں اسلامی نظام کو جو فوقیت اور برتری حاصل ہے۔ اس کی چند وجوہات یہ ہیں کہ یہ نظام ہر فرد کو جانفشانی کے ساتھ محنت مشقت کی دعوت دیتا ہے، اس کی ذاتی ملکیت کو نہ صرف تسلیم کرتا ہے بلکہ اس کی حفاظت بھی کرتا ہے، تاکہ انسان اسے اپنے ہاتھوں پامال نہ کرے۔ پھر اس کی تسلی کے لیے اس کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد اس کی دولت کا حقدار اس کے ورثاء کو قرار دیتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی خوابیدہ صلاحیت بیدار ہوتی ہے اور آدمی اپنے پیروں پر آپ کھڑا ہوتا ہے۔ اس کا عزم مستحکم اور اس کا حوصلہ جوان ہوتا ہے۔ اس کی حلال اور پاکیزہ کمائی اس کے پاکیزہ ارادوں کی تکمیل میں ممد و معاون بنتی ہے اور اس کی ناداری اور تنگدستی کے ازالہ کا سبب بنتی ہے۔

پھر اسلام ایک فرد کی تربیت پر انحصار نہیں کرتے ہوئے دیگر افراد اور پورے سماج کو فراموش نہیں کرتا، بلکہ اس کے درمیان عادلانہ استحکام اور توازن برقرار رکھتا ہے۔ کسی حق دار کو اس کے حق سے محروم نہیں رکھتا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنے کام سے کام رکھتا ہے، دولت کی مسلسل گردش ہوتی ہے اور ہر کوئی بلا کسی قسم کی زیادتی کے اپنے جائز حقوق سے مستفید اور رعایتوں سے شاد کام ہوتا ہے۔

اسلام کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ دولت پر اصل ملکیت اللہ کی ہے۔ اس نے انسان کو اپنا نائب بنایا۔ دولت میں تصرف کا حق تفویض کیا اور چونکہ مالک حقیقی باری تعالیٰ کی ذات ہے، اس لیے اس کو حق ہے کہ وہ اس دولت پر انسان کے تصرفات کو اپنی مرضی اور پسند کا پابند بنائے۔ چنانچہ انسان کو اپنے زیر تصرف اشیاء پر ملکیت تو حاصل ہے، لیکن یہ ملکیت آزاد اور بے لگام نہیں۔ اس پر دولت کے مالک حقیقی کی طرف سے جائز اور معقول ضابطے اور پابندیاں عائد ہیں۔ یہ مالک حقیقی بھی وہ ذاتِ واحد ہے جو امیر و غریب سب کا پروردگار ہے۔ اپنے بندوں پر وہ اس سے کہیں زیادہ مہربان ہے۔ جتنی ایک ماں اپنے بچے پر مہربان ہوتی ہے اور یہ اسی ہمہ داں اور ہمہ بیں ذات کا کرشمہ ہے کہ اس نے دولت کی حفاظت اس

کی افزائش، اس کی مسلسل گردش اور اس کی صحیح تقسیم اور خرچ کے لیے ایسے اصول اور ضابطے مقرر کیے جس میں ادنیٰ، اعلیٰ، امیر، غریب اور سماج کے ہر طبقہ کا مفاد مضمر ہے۔

یہ نظام اسراف وفضول خرچی کا سخت مخالف اور ایسا کرنے والوں کو شیطان کا بھائی تصور کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ انہیں ناداں اور نااہل قرار دیتا ہے اور ان کے ہاتھ آنے والی دولت سے انہیں محروم کرتا ہے:

﴿وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِىْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا﴾

(٤/ النسآء:٥)

"اور کم عقلوں کو اپنا وہ مال حوالہ نہ کرو جس کو اللہ نے تمہارے لیے (معیشت) سہارا بنایا ہے۔"

یہ نظامِ عشرت پسندی، عیش کوشی اور بے جا خوشحالی کے مظاہر کو لمحہ بھر کے لیے گوارا نہیں کرتا جس سے طبقہ واریت جنم لیتی ہے اور سماج میں اونچ نیچ پیدا ہوتی ہے۔ جہاں زر دار پیٹ کا پجاری اور نادار نان جوین کو ترس جاتا ہے۔ جہاں مالداروں کی زبان پر یہ نعرہ ہوتا ہے کہ

﴿اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ۝﴾ (٣٤/ سبا:٣٤)

"جو چیز تم دیکر بھیجے گئے ہو ہم اس کے منکر ہیں۔"

اور بالآخر اس اونچ نیچ اور نابرابری کا یہ انجام ہوتا ہے کہ پورا سماج عام انتشار اور پھر تباہی سے دوچار ہوتا ہے:

﴿وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا۝﴾ (١٧/ الاسرآء:١٦)

"اور جب ہمیں منظور ہوتا ہے کہ کسی بستی کو ہلاک کریں تو وہاں کے خوش حال لوگوں کو (اپنی فرمانبرداری) کا حکم دیتے ہیں۔ پس (جب) وہ اس بستی میں نافرمانی کرتے ہیں تو ہمارا عذاب ان پر ثابت ہو جاتا ہے، پس

ہم اسے بالکل برباد کر دیتے ہیں۔''

اسی بنیاد پر یہ نظام سونے چاندی کے برتنوں اور زرق برق کپڑوں کے استعمال پر پابندی لگاتا ہے۔ مجسمہ اور تعیش کے اسباب کو رکھنا برتنا اور تحفے تحائف میں دینا سب کو حرام قرار دیتا ہے۔ نیز اس لیے کہ ان کے استعمال سے گردنیں اکڑ جاتی ہیں اور دماغ آسمان پر پہنچ جاتا ہے۔ اسی وجہ سے مردوں کو سونے کے زیور اور ریشمی کپڑوں کا پہننا حرام ہے۔

یہ نظام ذخیرہ اندوزی اور سود خوری پر لعنت بھیجتا ہے۔ اس لیے کہ ان دو ستونوں پر سرمایہ داری کی حویلی تیار ہوتی ہے۔ جس سے مالدار زیادہ مالدار اور غریب زیادہ غریب ہوتے جاتے ہیں۔ حضور ﷺ نے علی الاعلان فرمایا کہ ''جس نے (۴۰) چالیس دن اناج کی ذخیرہ اندوزی کی وہ خدا سے بے تعلق اور خدا اس سے بری ہو جاتا ہے۔'' [1]

یہ نظام سود لینے اور دینے والوں کے خلاف خدا اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ کا اعلان کرتا ہے، تا آنکہ وہ توبہ نہ کریں۔ اس صورت میں انہیں اصل سرمایا بلا کم و کاست حاصل ہوگا، نہ ان کے ساتھ زیادتی ہوگی، نہ انہیں کسی کے ساتھ زیادتی کرنے کا حق ہوگا۔ سود خوری اور ذخیرہ اندوزی اس لیے بھی سخت ناپسندیدہ ہے کہ سرمایہ دار اس طرح غریبوں کا خون چوس کر مالدار بنتا ہے اور غریب اور زیادہ غریب ہوتے جاتے ہیں۔

یہ نظام سونے چاندی کو جوڑ جوڑ کر رکھنے کا مخالف ہے اور انہیں سخت عذاب سے ڈراتا ہے اور بقدر نصاب سرمائے پر زکوٰۃ واجب کرتا ہے، خواہ مالک اس کی افزائش کی فکر کرے یا یونہی پڑا رہنے دے۔ یہ نظام سرمائے کے استعمال اور جائز کاروبار میں اسے لگانے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اس لیے کہ یہ نہ ہو تو اس کی گردش رک جاتی ہے اور وہ یونہی بیکار پڑا رہ جاتا ہے یا ہر سال محض اس کی زکوٰۃ نکلتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یتیموں کے سرپرست اور ان کے ذمہ داروں کو تاکید کی جاتی ہے کہ جہاں تک ہو سکے حسن تدبیر کے

[1] مستدرك حاكم على الصحيحين، ج ۳ ص: ۸۲۱، رقم ۲۱۶۵؛ مسند احمد، ۲/ ۳۳، رقم: ٤٨٦٥۔

ساتھ مال کی افزائش سے غافل نہ رہیں۔

لین دین کی تمام قسمیں خواہ ان کا تعلق خرید وفروخت یا شرکت ومضاربت سے ہو یا آجر ومستأجر اور مالک ومزدور سے، ان میں سے ہر ایک کے لیے اسلام کے اپنے وضع کیے ہوئے قانون ہیں۔ جن سے حقوق بحال ہوتے ہیں۔ انسانی رشتے استوار ہوتے ہیں اور کوئی فرد یا گروپ کسی دوسرے پر ظلم وزیادتی کرسکتا ہے نہ اس کے حقوق میں کسی قسم کی کمی کرسکتا ہے۔

اسلام میں غریب طبقہ کا وجود نہیں

اسلام اپنے اصول وضابطے اور اپنے دستور اور نصب العین کے ذریعہ فقر وناداری کی بیخ کنی کرتا ہے۔ ایک سے زائد تدابیر کے ذریعے اس کی کوشش کرتا ہے کہ غریبوں کی غریبی کا خاتمہ ہو اور دوسروں کی طرح یہ بھی آسودہ اور بے نیاز ہوں، لیکن تمام کوشش اور کاوش کے باوجود اگر کوئی فرد یا گروہ غریب رہا تو اسلام کی نظر میں انہیں کسی صورت غریب طبقہ کے نام سے یاد نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے کہ ''طبقیت'' ایک قسم کی گروہ بندی کا نام ہے، جو قانون اور رواج کے سہارے قائم اور نسل در نسل اس کا سلسلہ برقرار رہتا ہے، لیکن جہاں تک غریبی کا تعلق ہے، اسلامی دستور اور اسلامی ماحول غریبی کو خاندانی اثرات کی شکل میں فرد واحد یا سماج پر مسلط نہیں کرتا، نہ یہ پسند کرتا ہے کہ خاندان میں پشت در پشت غربت اور افلاس باقی رہے۔ اسلام کی نظر میں غربت راسخ یا اٹل نہیں، دھوپ چھاؤں اور آنی جانی ہے۔ کبھی اس کا وجود ہوتا ہے، کبھی یہ اوجھل ہوجاتی ہے اور کبھی یکسر ناپید ہوجاتی ہے۔ اسلامی معاشرے میں مفلس اور غریب کسی گروہ کی شکل میں برقرار نہیں رہ سکتے، اس لیے کہ اگر آج کوئی غریب ہے تو کل وہ صاحب ثروت اور مال دار بھی بن سکتا ہے۔ کیونکہ عزم وحوصلہ کا اظہار اور حدود میں رہ کر جستجو اور محنت کا استعمال ہر کوئی کرسکتا ہے۔ یہ دروازہ کسی کے لیے بند نہیں۔

﴿ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ﴾ (۲٤/ النور:۳۲)

''اگر وہ فقیر ہوں گے تو اللہ ان کو اپنے فضل سے خوشحال کردے گا''

﴿ سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا ﴾ (٦٥/ الطلاق:۷)

"اللہ عنقریب تنگی کے بعد کشائش بخشے گا۔"

عزت نفس کی حفاظت جہاں تک اسلامی معاشرے کا تعلق ہے۔کوئی غریب اس لیے پست اور ذلیل وحقیر نہیں سمجھا جا سکتا، نہ ہی اپنے جائز حقوق سے محروم کیا جا سکتا ہے کہ وہ تہی دست اور مفلس ہے، بلکہ اسلامی نظام مسلم سماج خصوصاً غریبوں کو یاد دلاتا ہے کہ اصل دولت سونا چاندی نہیں، دھن دولت، کھیت اور جائیداد سب کچھ نہیں، بلکہ اصل دولت ایمان ویقین، تقویٰ وعمل صالح اور علم ومعرفت کا حصول ہے۔ جسے پانے والا سب سے بڑا مالدار اور جسے کھونے والا سب سے بڑا قلاش اور نادار ہے۔ چنانچہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ﴾ (٤٩/ الحجرات:١٣)

"بلاشبہ اللہ کے نزدیک تم سب میں عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیز گار ہو۔"

﴿ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ (٣٩/ الزمر:٩)

"بھلا جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے دونوں برابر ہو سکتے ہیں۔"

﴿ يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ﴾

(٥٨/ المجادلة:١١)

"جو تم میں سے ایمان لائے ہیں اور جو اہل علم ہیں اللہ ان کے درجات بلند کرے گا۔"

﴿ وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَلَا الْمُسِيْٓءُ ﴾ (٤٠/ الغافر:٥٨)

"اور اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں، اور نہ ایمان والے نیکوکار اور نہ بدکار برابر ہیں۔"

جاہ وثروت اور مال ودولت سے قدوقامت کی پیمائش اسلام کی نظر میں ٹھیٹ جاہلی پیمانہ ہے۔ دورِ جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ انسان اخلاقِ فاضلہ اور اپنی اندرونی اعلیٰ خصوصیت سے نہیں، اپنی دولت اور سماج میں اپنی جھوٹی وجاہت اور عزت سے مقبول ہوتا تھا۔

فقیمة رب الألف ألف و زد تزد و قیمة رب الدرهم الفرد درهم

لکھ پتی کی عزت لاکھوں کے برابر اور اس سے زیادہ کی اس سے زیادہ
اور جو پھوٹی کوڑی والا ہے اس کی عزت بھی پھوٹی کوڑی کے برابر

یہی وجہ تھی کہ حضور اکرم ﷺ نے جب نبوت کا اعلان کیا تو جاہل عربوں نے الزام لگایا کہ وحی اترنی تھی تو مکہ کے ولید بن مغیرہ قرشی، یا طائف کے عروہ بن مسعود ثقفی پر اترتی، جو بڑے دولت منداور اپنی قوم کے رئیس ہیں۔

﴿وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ﴾

(٤٣/ الزخرف:٣١)

''اور انہوں نے کہا کہ یہ قرآن ان دونوں بستیوں (یعنی مکہ اور طائف) میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہ نازل کیا گیا۔''

قدر و قیمت کے اس جھوٹے پیمانے کو اسلام نے سب سے پہلے پاش پاش کیا اور اس حقیقت کا اعلان کیا کہ انسان کی عزت اس کے تن و توش اس کے ڈیل ڈول، کپڑوں کی سج دھج، یا اس کی ڈھیروں دولت میں نہیں، بلکہ اس کی عظمت کا حقیقی معیار اس کی ایمانی طاقت، اس کے علم و فضل اور اس کے کردار کی بلندی میں ہے۔

سرور عالم ﷺ نے صاف لفظوں میں فرمایا:

((رُبَّ أَشْعَثَ أَغْبَرَ ذِي طِمْرَيْنِ لَا يُؤْبَهُ لَهُ لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَأَبَرَّهُ)) [1]

---

[1] مسلم، كتاب البر والصلة والأدب، باب فضل الضعفاء والخاملين، رقم: ٦٦٨٢؛ ترمذي، كتاب المناقب، باب مناقب براء بن مالك، رقم: ٣٨٥٤؛ مستدرك حاكم، كتاب الرقاق، رقم: ٧٩٣٢۔

یہ روایت باختلاف الفاظ ذیل کے مطابق منقول ہے۔

مدفوعًا بالأبواب...... (احمد، مسلم) دروازوں سے دھکے دے کر نکالے گئے ایسے ہوتے ہیں۔

تنبوعنه أعين الناس...... (حاکم، ابونعیم) جن پر لوگوں کی نگاہیں نہ پڑیں۔

رب ذی طمرین لا یؤبه له...... (بزار) جنہیں کوئی پناہ نہ دے......

سیوطی نے اس روایت کے صحیح ہونے کی صراحت کی ہے۔

”بہت سے غبار آلود، بوسیدہ کپڑے اور پراگندہ بال والے ایسے ہوتے ہیں جنہیں کوئی پناہ نہ دے، لیکن یہی لوگ خدا پر اعتماد کرتے ہوئے کوئی قسم کھا بیٹھیں تو باری تعالیٰ ان کی قسم پوری فرماتا ہے۔“

اس کے بالمقابل آپ ﷺ نے فرمایا:

((یَأْتِی الرَّجُلُ الْعَظِیْمُ السَّمِیْنُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فَلَا یَزِنُ عِنْدَ اللّٰهِ جَنَاحَ بَعُوْضَةٍ وَقَالَ اِقْرَءُ وْا اِنْ شِئْتُمْ۔ ﴿فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا﴾ (۱۸/ الکھف:۱۰۵))) [2]

”قیامت کے دن نامی گرامی اور بھاری بھرکم آدمی خدا کے سامنے اس طرح پیش ہوگا کہ اللہ کے نزدیک اس کی حیثیت مچھر کے پر کے برابر بھی نہ ہوگی۔ جو چاہو تو اس آیت کو پڑھ لو: ”ان کے اعمال کا ذرا بھی وزن ہم قائم نہ کریں گے۔“

غریبی کا خاتمہ

موجودہ ترقی یافتہ زمانہ نظیر کے بغیر کوئی نظریہ تسلیم نہیں کرتا۔

اس لیے ذیل میں چند ایسے تاریخی واقعات پیش کئے جاتے ہیں، جن سے معلوم ہوگا کہ افلاس وناداری کے خلاف اسلامی نظام کی فتح ایک زندہ حقیقت ہے اور عجیب بات ہے کہ اس فتح کی پیشین گوئی سرور عالم ﷺ نے اس وقت کی تھی، جب کہ ان کے وقوع پذیر ہونے کی موہوم سی امید بھی نہ تھی، درحقیقت وحی الٰہی کے ذریعہ آپ کو بہت پہلے سے آگاہ کر دیا گیا تھا کہ لوگوں نے اگر اسلامی ہدایات کی ہو بہو پیروی کی تو اس کے نتیجے میں کس قسم کے اثرت مرتب ہوں گے اور خیر و برکت کے کن چشموں سے وہ سیراب ہوں گے؟

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب صحیح البخاری میں حضرت عدی بن حاتم طائی رضی اللہ عنہ سے

[2] بخاری، کتاب التفسیر، باب قوله ﴿أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ الآیة، رقم: ۴۷۲۹؛ مسلم، کتاب صفات المنافقین والاحکامهم، باب صفة القیامة والجنة والنار، رقم: ۷۰۴۵۔

روایت کی ہے کہ وہ اسلام قبول کرنے کی غرض سے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اتنے میں دو آدمی حاضر خدمت ہوئے، ایک کو افلاس کی شکایت تھی اور دوسرا اگرچہ مالدار تھا اور کہیں مال واسباب لے جانا چاہتا تھا لیکن راستہ میں امن وامان نہ تھا۔ اس لیے راستہ بند ہونے کا شاکی تھا۔ راستہ بند ہو جانے کا جواب دیتے ہوئے آپ ﷺ نے حضرت عدی سے فرمایا: ''عدی! کبھی تم حیرہ گئے ہو۔'' (جو عراق کا قدیم شہر ہے) عدی نے عرض کیا، حضور! خود تو نہیں گیا۔ ہاں لوگوں سے سنتا ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''عدی! اگر تمہاری عمر دراز ہوئی تو تم اپنی آنکھوں سے دیکھو گے کہ ایک عورت حیرہ سے سفر کرتی ہوئی خانہ کعبہ کے طواف کے لیے آئے گی اور اسے خدا کے سوا کسی کا خوف نہ ہوگا۔'' [1]

حضرت عدی کہتے ہیں کہ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ قبیلہ طے کے ڈاکوؤں کا اس وقت صفایا ہو گیا ہوگا، جن سے سارا عرب عاجز ہے۔ (یعنی حضرت عدی کو اس وقت بہت حیرت ہوئی کہ آئندہ چل کر امن وامان کا اس قدر دور دورہ کیونکر ہوگا؟ جبکہ انہیں اپنے قبیلے کے رہزنوں کا حال اچھی طرح معلوم تھا، جن سے ہر کوئی پریشان تھا) ابھی حضرت عدی کی سابقہ حیرت برقرار تھی کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''رہی محتاجی! تو تمہاری عمر اگر دراز ہوئی تو ایک وقت آئے گا کہ کسریٰ کے خزانے تمہارے ہاتھ آئیں گے!'' حضرت عدی کہتے ہیں کہ مجھے پھر بڑی حیرت ہوئی اور میں نے عرض کیا، حضور کیا کسریٰ بن ہرمز کے خزانے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں کسریٰ بن ہرمز کے خزانے اور اگر زندگی نے تمہارے ساتھ وفا کی تو تم دیکھو گے کہ ایک وقت آئے گا جب آدمی خیرات کا مال لیے پھرے گا اور لینے والا نہیں ملے گا۔''

حضرت عدی بالآخر مسلمان ہوئے اور ایک اچھے مسلمان ثابت ہوئے۔ پھر وہ وقت آیا جب انہوں نے پہلی پیشین گوئی اپنی آنکھوں سے پوری ہوتے ہوئے دیکھی، چنانچہ خود فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ عورت حیرہ سے سفر کرتی ہوئی خانہ کعبہ کا طواف

[1] صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب علامات النبوۃ فی الاسلام، رقم: ۳۵۹۵؛ مسند احمد: ٤/ ۲۵۸، رقم: ۱۷۷۹٦۔

کرنے کے لیے آتی ہے اور اسے خوف خدا کے سوا دوسرا کوئی خوف دامن گیر نہیں ہوتا۔

اسی طرح کسریٰ بن ہرمز کا خزانہ حاصل کرنے والوں میں میں بھی شریک تھا اور آپ ﷺ کا یہ دوسرا ارشاد بھی پورا ہوا۔

پھر حضرت عدی رضی اللہ عنہ بڑی حسرت کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ ہو سکتا ہے۔ میری آنکھیں وہ منظر نہ دیکھ سکیں، لیکن اگر تمہاری زندگی نے وفا کی، تو تم ابوالقاسم ﷺ کی تیسری پیشین گوئی بھی دیکھو گے کہ آدمی خیرات کا مال لیے پھرے گا اور کوئی لینے والا نہ ملے گا (یعنی دولت کی فراوانی کی وجہ سے تلاش کے باوجود غریب کہیں نظر نہ آئیں گے) [1]

اور حضور اکرم ﷺ نے حضرت عدی سے جو یہ فرمایا کہ

''اگر زندگی نے تمہارے ساتھ وفا کی تو تم دیکھو گے کہ ایک وقت آئے گا جب آدمی خیرات کا مال لیے پھرے گا اور لینے والا نہیں ملے گا۔''......اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ عنقریب یہ واقعہ پیش آئے گا اور صحابہ میں جن کی عمریں دراز ہوں گی وہ اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں گے، تاریخ شاہد ہے کہ خلیفۂ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں اس قسم کے واقعات پیش آئے، جس کی تفصیل ہم آیندہ ذکر کریں گے۔

یہ اور اس قسم کی بیشتر روایتیں رسول مقبول ﷺ سے بکثرت منقول ہیں، جن میں آپ ﷺ نے پہلے سے یہ اطلاع فرما دی تھی کہ ایک وقت آئے گا جب دولت کا زبردست سیلاب امت پر امنڈ آئے گا اور اس کے نتیجہ میں نہ غریب رہیں گے اور نہ زکوۃ پر اپنا حق جتلانے والا کوئی باقی رہے گا، اس بارے میں شک وشبہ کی ذرہ برابر گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ اس اعتماد کے ساتھ اس قدر سچی پیشین گوئی بھی نبی معصوم ہی دے سکتا ہے، جس کی زبان سے صادر ہونے والے الفاظ اس کی آواز نہیں خدا کی آواز ہوتے ہیں، اس پیشین گوئی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غریبی ایسا مرض نہیں جس کا علاج ناممکن ہو، حالانکہ تورات

---

[1] عمدۃ القاری، کتاب المناقب، باب علامات النبوۃ فی الاسلام، تحت حدیث عدی بن حاتم ج ۱۶ / ۳۵۔

اپنا یہ فیصلہ سنا چکی ہے کہ

''غریبی ازل سے ہے، ابد تک رہے گی اور غریب دنیا سے کبھی ختم نہ ہوں گے۔''

(تورات، تثنیہ، ۱۵، ۱۰، ۱۱)

ذیل میں مسلم سماج سے غربت کے ازالے سے متعلق چند صراحتیں ذکر کی جاتی ہیں۔

امام بخاری اور دیگر محدثین حضرت حارثہ بن وہب خزاعی رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا، میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ فرماتے تھے...... ''لوگو! (آج موقعہ ہے) خیرات کرلو، اس لیے کہ ایک وقت آئے گا، جب آدمی زکوٰۃ اور خیرات کی رقم لے کر گھومتا پھرے گا، لیکن کوئی لینے والا نہ ملے گا، (تلاش بسیار کے بعد کوئی ملے گا تو) کہے گا کل لائے ہوتے تو میں قبول کر لیتا، آج مجھے ضرورت نہیں ہے۔'' [1]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت اس وقت تک نہ آئے گی، جب تک کہ لوگوں میں مال و دولت کی فراوانی نہ ہوگی، گویا دھن دولت کا سیلاب آ گیا ہوگا، آدمی چاہے گا کہ کوئی خیرات قبول کرنے والا مل جائے، لیکن وہ جس کے سامنے پیش کرے گا، جواب میں وہ یہی کہے گا کہ ''(آج تو) مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے!'' [2]

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ایک وقت آئے گا جب آدمی زکوٰۃ خیرات دینے کے لیے سونا لے کر ادھر ادھر گھومتا پھرے گا، لیکن کوئی اسے لینے والا نہ ملے گا۔'' [3]

اور پھر وہ وقت آ ہی گیا جب مسلمان خوشحال اور آسودہ حال ہوئے، دولت کی ریل پیل بڑھی اور مسلمانوں میں ایسا کوئی آدمی نہ رہا جو خیرات کا مستحق ہو، یہ اس وقت ہوا جب دستور نبوت کے مطابق خلافت راشدہ کے طرز پر ایک حکومت قائم ہوئی اور اس کو حد

---

[1] فتح الباری، کتاب الزکاۃ، باب الصدقة قبل الرد، ج ۳ ص: ۱۸۱۔

[2] فتح الباری، کتاب الزکاۃ، باب الصدقة قبل الرد، ج ۳ ص: ۱۸۱۔

[3] فتح الباری، کتاب الزکاۃ، باب الصدقة قبل الرد، ج ۳ ص: ۱۸۱۔

درجہ استحکام نصیب ہوا۔ یہ زمانہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا زمانہ تھا۔

جیسا کہ امام بیہقی نے حضرت عمر بن اسید (ابن عبدالرحمٰن بن زید بن خطاب) سے نقل کیا ہے۔

چنانچہ انہوں نے دلائل میں روایت کی ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ (متوفی سن ۱۰۱ھ) نے صرف ڈھائی برس خلافت کی، لیکن اسی مختصر زمانے میں یہ حالت ہوگئی کہ لوگ ان کے تحصیلداروں کے پاس بکثرت مال لے کر آتے تھے، اور کہتے تھے، غریبوں کو دیدو! لیکن ان کو مال واپس لے جانا پڑتا تھا، کیونکہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے تمام لوگوں کو اس قدر مالا مال کر دیا تھا، کہ کوئی شخص اس قابل نہیں ملتا تھا کہ اس کو یہ مال دیا جائے اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد امام بیہقی لکھتے ہیں: اس سے حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کی روایت کی تصدیق ہوتی ہے۔ [1]

یحییٰ بن سعید کا بیان ہے کہ مجھ کو حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے افریقہ کا صدقہ وصول کرنے کے لیے بھیجا، میں نے صدقہ وصول کر کے غریبوں کو بلایا، تاکہ ان میں تقسیم کر دوں، لیکن مجھ کو کوئی فقیر نہیں ملا، کیونکہ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے لوگوں کو مالدار بنا دیا تھا۔ اس لیے میں نے صدقہ کی رقم سے غلام خرید کر آزاد کر دیئے۔ [2]

تاریخ شاہد ہے کہ یہ فارغ البالی اور آسودگی، جس کا ذکر حضرت یحییٰ بن سعید رحمۃ اللہ علیہ نے کیا...... محض افریقہ اور اس کے علاقوں تک محدود نہیں تھی، بلکہ تاریخی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ اس دور میں کل ملت اسلامیہ اور مسلم ملکوں میں اسی قسم کی خوشحالی اور فارغ البالی کا دور دورہ تھا۔

ابوعبید رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے عبدالحمید والی عراق کو لکھا، امدادی رقوم اور وظائف لوگوں میں تقسیم کرا دو! عبدالحمید نے جواب میں لکھا (بحمد اللہ) اس کی تعمیل ہو چکی، پھر بھی کچھ نقد رقوم بیت المال میں جمع ہیں (اور اس کے بارے میں

---

[1] عمدة القاري، كتاب المناقب، باب علامات النبوة في الاسلام، ج١٦ ص: ١٣٥ تحت حديث عدي بن حاتم۔ [2] سيرة عمر بن عبدالعزيز، تحت عنوان إغناؤُ الناس حتى لم يجد في أفريقية من يأخذ منه الصدقة، ص: ٦٩۔

آنجناب کے حکم کا انتظار ہے) جواب میں آپ نے لکھا، باقی ماندہ رقم سے قرضداروں کے قرض ادا کرا دو، حاکم نے جواب میں لکھا، اس کی بھی تعمیل ہو چکی ہے اور رقم بچ رہی ہے، آپ نے سہ بارہ لکھا، اگر کوئی شادی کا خواہشمند ہو تو اس کے لیے مہر اور دیگر اخراجات کا انتظام کردو۔ حاکم نے لکھا اس کی بھی تعمیل ہو چکی ہے۔ آپ نے پھر لکھا، جن غیر مسلموں سے خراج وصول کیا گیا، انہیں بیت المال سے اس کی دوگنی مقدار رقم بطور قرض دے دو، تاکہ اس کے ذریعہ زیادہ اور بہتر پیداوار انہیں حاصل ہوتی رہے اور انہیں جتلا دو کہ قرض وصول کرنے میں کوئی عجلت نہیں کی جائے گی۔

خوشحالی اور فارغ البالی کی یہ ہلکی سی ایک جھلک تھی، جو تمام تر اسلامی عدل و مساوات کا نتیجہ تھی، جس کا ادنیٰ کرشمہ یہ تھا کہ بار بار کی تلاش و جستجو کے بعد بھی پورے ملک میں کوئی حاجت مند نہ رہا۔ اس پر مستزاد یہ کہ ہر ضرورت مند کو اس کی ضرورت بلا ظلم و جور اور بغیر طلب و جستجو اس تک پہنچا دی گئی، اس نظام کی بدولت بیت المال سے قرض خواہوں کے قرضے بیباق ہوئے، شادی کی خواہش رکھنے والوں کی مرادیں بر آئیں اور جب پوری مملکت میں کوئی حاجت مند نہ رہا تو امیر المومنین نے غریب کسانوں اور کاشت کاروں کو طویل المیعاد قرض دلوائے، تاکہ پیداوار میں اضافہ ہو اور خلق خدا کو فائدہ پہنچے، حیرت کا مقام ہے کہ آپ نے یہ اسکیم ایسے وقت میں چلائی، جس کے ٹھیک تیرہ سو سال بعد کہیں دنیا بنک کاری اور اس کے نظام سے واقف ہوئی۔

درحقیقت حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ اچھی پیداوار سے تنہا کاشتکاروں کا مفاد وابستہ نہیں، بلکہ اس کے اندر حکومت اور عوام سب کا مفاد مضمر ہے، لہٰذا اس مقصد کے حصول کے لیے کسانوں اور مزدوروں کی ہر ممکنہ امداد حکومتوں کا اولین فرض ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا زمانہ تاریخ اسلامی کا عہد زریں کہلانے کا مستحق ہے۔ آپ کے زمانے میں جہاں عدل و انصاف اور امن و مساوات کا دور دورہ تھا، رعایا اس

قدر خوشحال اور آسودہ تھی کہ معلوم ہوتا تھا، آسمان سے رزق کے دہانے کھل گئے ہیں اور زمین بھی اپنا سارا خزانہ اگل کر رکھ دے گی۔

اس وقت کے سکھ چین کا کچھ اندازہ والی بصرہ کی ایک تحریر سے ہوتا ہے، جس میں انہوں نے حضرت عمر رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا تھا:

رعیت کی خوشحالی اور آسودگی دیکھ کر یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں ان کے اندر غرور اور نخوت نہ پیدا ہو جائے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں لکھا:

حساب کتاب کے بعد جب جنتی جنت میں، دوزخی دوزخ میں پہنچ جائیں گے اور باری تعالیٰ جنتیوں سے اپنی خوشنودی کا اظہار کریں گے (اور ظاہر ہے یہ جنت کی سب سے بڑی نعمت ہے) تو تمام جنتی بیساختہ پکار اٹھیں گے:

﴿ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي صَدَقَنَا وَعْدَهُ ﴾ (۳۹/ الزمر:۷۴)

''اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے ہم سے اپنا وعدہ سچا کیا۔''

(جس طرح جنتی، جنت کی لامحدود آسودگی اور سب سے بڑی خوشی پا کر بیساختہ خدا کا شکریہ ادا کریں گے) تم اپنے ماتحتوں کو اسی کی تلقین کرو اور انہیں تعلیم دو کہ وہ ان نعمتوں کی قدر کریں اور اپنے رب کا شکریہ ادا کریں۔ [1]

ان معدودے چند واقعات کا تعلق حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے دور خلافت سے ہے۔ تاریخ کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے پہلے خلیفۂ دوم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اسلامی حکومت کا دائرہ جن ملکوں تک وسیع ہوا، ہر جگہ خوشحالی اور رفارغ البالی کا دور دورہ تھا۔ چنانچہ اسلامی معاشیات کے ماہر ابوعبید لکھتے ہیں:

''حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں

---

[1] سيرة عمر بن عبدالعزيز على مارواه مالك بن أنس واصحابه تحت عنون أمره الناس بحمد الله و كتابه الى عدى بن أرطاة ص: ٦٩۔

یمن کے گورنر تھے۔ ایک سال معاذ نے یمن کی تہائی زکوٰۃ دربار خلافت میں روانہ فرمائی، حضرت عمر کو سخت ناگوار ہوا۔ آپ نے انہیں خط لکھا..... تمہارا کام محصول وصول کرنا نہیں ہے، اس لیے آیندہ جہاں سے زکوٰۃ وصول کرو، وہیں خرچ کرو۔ حضرت معاذ نے جواب میں تحریر فرمایا چونکہ یمن میں ایسا کوئی شخص نہ تھا، جسے زکوٰۃ دی جائے، اس لیے رقم آپ کے پاس روانہ کردی گئی ہے۔ اتفاق سے حضرت معاذ نے آیندہ سال دگنی اور اس کے بعد آنے والے سال میں سہ گنی رقم ارسال فرمائی اور جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حسب سابق تنبیہ فرمائی تو آپ نے جواب میں وہی عذر پیش کیا کہ یہاں کوئی زکوٰۃ لینے والا نہیں، میں کیا کروں؟" [1]

سبحان اللہ! وہ زمانہ بھی کیسا خیر و برکت کا زمانہ تھا، جب ادنیٰ شہری سے لے کر حاکم وقت تک خوف خدا سے سرشار اور اسلامی تعلیمات پر دل و جان سے نثار تھا۔ یہی وجہ تھی کہ زمین و آسمان کی برکتوں سے وہ مستفید ہوتے تھے اور دنیا میں رہ کر وہ جنت کے مزے لیتے تھے۔

کس قدر حیرت کی بات ہے کہ ہم اس دور کے ان زریں واقعات کو پڑھتے ہیں اور یوں ہی آگے بڑھ جاتے ہیں، لیکن ان کی اہمیت اور ندرت کو مطلق محسوس نہیں کرتے جبکہ اقوام عالم کے سامنے ہم اپنے ان اسلاف کو پیش کر سکتے ہیں اور یہ بطور چیلنج دنیا والوں سے کہہ سکتے ہیں کہ کیا تاریخ عالم دنیا کے اسٹیج پر، کہیں اور کسی زمانے میں، جہانبانی اور حکمرانی کا ایسا ایک نمونہ بھی دکھا سکتی ہے؟ کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پہلے یا بعد میں ایسا بھی کوئی حاکم گزرا، جس نے اپنے ماتحتوں کو یہ ممانعتی حکم بھیجا ہو کہ وہ مرکز میں روپیہ نہ بھیجیں؟ کیا آج تک کسی گورنر نے اپنے ماتحت آفیسران کو یہ ہدایت بھی دی ہے کہ اور بادشاہوں کی طرح انہیں جزیہ اور خراج کی جبری وصولی کے لیے نہیں بھیجا گیا۔ ان کا کام تو بس یہ ہے کہ جہاں سے روپیہ وصول کریں وہیں غریبوں میں تقسیم کر دیں اور خود تہی دست اپنے مستقر پر

---

[1] كتاب الأموال، باب قسم الصدقة فى بلدها وحملها الى بلدٍ سواهُ ومن أولى بأن يبدأبه منها، ص: ٥٩٦۔

لوٹ آئیں؟ کیا آج حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی نظیر، یا آپ کی سیرت کا عشر عشیر بھی پیش کیا جاسکتا ہے، جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بار بار اس امر کی یقین دہانی کررہے تھے کہ ان کی زیر نگیں رعیت کو زکوۃ یا اس قبیل کی کسی امداد چنداں کی حاجت نہیں، لہٰذا مرکز اس رقم کو قبول کرے؟ ظاہر ہے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ اس یقین پر خود کو اس لیے مجبور پاتے تھے کہ انہوں نے بہ نفس نفیس حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا کہ جس جگہ کے مالداروں سے زکوۃ وصول کی جائے اسی جگہ کے غریبوں میں تقسیم بھی کردی جائے۔

اور یہ حقیقت ہے کہ مسلمان خواہ دنیا میں کہیں آباد ہوں، ان کی حیثیت جسد واحد کی سی ہے، اگر کسی علاقے کے مسلمان خوشحال اور آسودہ ہیں اور ان کو زکوۃ لینے کی چنداں حاجت نہیں، تو وہاں سے زکوۃ کی رقم ایسی جگہ منتقل کردی جائے گی جہاں اس کی ضرورت ہے اور اگر خوش قسمتی سے قرب وجوار کی بستیاں بھی آسودہ ہوں تو پھر مرکز میں ان رقوم کی بہم رسانی اور وہاں سے ان کی مناسب تقسیم میں مضائقہ نہیں۔

اوپر پیش کیے گئے یہ تاریخی واقعات مخالفین اسلام کے اس جھوٹ کا پردہ بھی فاش کرتے ہیں کہ اسلام کا نظام زکوۃ، اس کی جانب سے شکست کا اعلان ہے، اسلام کھل کر اس کا اعتراف کرتا ہے کہ غریبی لاعلاج مرض ہے اور مسلمانوں میں یہ مرض سدا قائم اور باقی رہے گا۔

بہرکیف یہ اسلامی نظام کے فیوض و برکات کی ایک جھلک تھی، تاریخ شاہد ہے کہ جہاں کہیں اس نظام کا قیام عمل میں آیا، وہاں ایسے ہی زبردست انقلاب رونما ہوئے اور اس ملک کی کایا پلٹ گئی، لیکن بعد کے مسلم ملکوں کی اس بدنصیبی کو کیا کیا جائے؟ کہ انہوں نے اس نظام کو مطلق اہمیت نہ دی اور نتیجے میں اس کی برکتوں سے محروم رہے۔ (فَإِلَى اللّٰهِ الْمُشْتَكٰى)

آخر میں ہم ایک بار پھر عرض کریں گے کہ اسلام کے نزدیک غریبی محض ایک سماجی روگ ہے، لیکن ایسا روگ بھی نہیں، جس سے پیچھا چھڑانا سخت دشوار ہو، بلکہ جس طرح عام جسمانی امراض کا علاج مناسب تدابیر سے ہوجاتا ہے، اس کا علاج بھی ممکن ہے، لیکن ہماری نظر میں اس کی مناسب تدبیر بس یہی ہے کہ لوگ اسلامی تعلیمات کو اپنائیں، اس کی

سفارشات کو من و عن تسلیم کریں اور اس پر سختی سے عمل کریں۔

اور پھر خدا نے چاہا تو وہ وقت آئے گا، جب غریبی اور افلاس کے سوتے خشک ہوں گے، عام خوشحالی اور فارغ البالی کے چشمے پھوٹ پڑیں گے اور پورے انسانی سماج میں ایسا کوئی فرد نہ ہوگا، جو بجا طور پر زکوٰۃ وخیرات کا مستحق خود کو ثابت کرے گا۔

﴿وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ﴾ (١٤/ ابراهيم:٢٠)

تب خدا نے چاہا تو زکوٰۃ کی رقوم زکوٰۃ کے دیگر مصارف میں خرچ ہوں گی، جس کا ذکر قرآن پاک نے تفصیل سے کیا ہے۔ جیسے:

﴿وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ﴾ (٩/ التوبة:٦٠)

وغیرہ۔
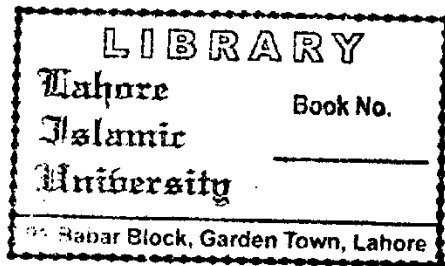
مؤلف فرماتے ہیں۔ الحمد للہ! مورخہ ۲۰ ذی القعدہ ۱۳۸۶ھ مطابق یکم مارچ ۱۹۶۷ء کو اس کتاب سے فراغت پائی۔

اسلام میں
غریبی کا علاج